چند قدم اقبال کے ساتھ

محمد ظہیر الدین احمد

ناشر
اقبال اکیڈیمی حیدر آباد (انڈیا)

چند قدم اقبال کے ساتھ

محمد ظہیر الدین احمد

ناشر: اقبال اکیڈیمی حیدرآباد۔ (انڈیا)
فون: 040-66663950

نام کتاب : چند قدم اقبال کے ساتھ

مصنف : محمد ظہیر الدین احمد

سنہ اشاعت : 2012ء

تعداد اشاعت : 500

کمپوزنگ و طباعت : شارپ کمپیوٹرس، ملک پیٹ حیدر آباد، فون: 9392427796

قیمت : 150 روپے

ناشر : اقبال اکیڈیمی، حیدرآباد۔ (انڈیا)

ISBN : 81-86370-50-1

کتاب ملنے کے پتے

☆ اقبال اکیڈیمی، گلشن خلیل: 10-5-7/1، تالاب ماں صاحبہ، حیدرآباد 500028، آندھرا پردیش (انڈیا)۔ فون 66663950
e-mail:ihfiqbal@hotmail.com

☆ اردو بک ڈپو، انجمن ترقی اردو، گلشن حبیب، اردو ہال حمایت نگر، حیدرآباد۔ فون: 040-23222919

☆ سب رس کتاب گھر، ادارۂ ادبیات اردو، پنجہ گٹہ، حیدرآباد

☆☆☆

فہرست

☆☆☆

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡم

کچھ اس کتاب کے بارے میں

اقبالیات پر یہ کتاب آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اس لئے مناسب ہوگا اگر بہ حیثیت مضمون نگار کچھ باتیں آپ کی خدمت میں پیش کر دی جائیں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ میرا کوئی ایسا ارادہ نہیں تھا کہ میرے مضامین پر مشتمل یہ کتاب شائع ہو کیوں کہ اقبالیات اور اس کے مختلف شعبوں پر ہزاروں کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور ہو رہی ہیں۔

لیکن اقبالیات اور اقبال اکیڈیمی سے برسوں کی وابستگی کی وجہ سے بعض مخلص احباب اور بزرگوں کی توجہ دہانی پر اس کتاب کو شائع کرنے کا فیصلہ کرنا پڑا۔

ان بزرگوں میں خصوصاً پروفیسر سید سراج الدین مرحوم صدر اقبال اکیڈیمی کی توجہ دہانی شامل ہے۔ اسی وجہ سے تقریباً نصف صدی کے دوران لکھے گئے مضامین کو ڈھونڈنا پڑا۔

جو مضامین مل سکے انہیں پیش کرنے کی جراءت کر رہا ہوں۔

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں تمام مضامین تقریباً نصف صدی کے عرصہ پر محیط ہیں۔

اس طویل زمانی فصل کی وجہ سے آپ کو بعض مضامین سطحی معلوم ہونگے۔

ان میں تکرار بھی ملے گی اور شاید کبھی کوئی بات کام کی بھی نکل آئے۔

مجھے اقبال اکیڈیمی کے بانی اور صدر جناب سید خلیل اللہ حسینی صاحب کے ساتھ کام کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ اس کے بعد پروفیسر عالم خوندمیری، پروفیسر سید سراج الدین صدور اکیڈیمی کے علاوہ پروفیسر صلاح الدین اور پروفیسر غلام دستگیر رشید وغیرہ سے استفادہ کا موقع ملا۔

کتنے ہی اہل نظر اقبال شناس ہیں جن کے نام اب مجھے یاد نہیں آ رہے ہیں۔ اگر مجھے اقبال پر کچھ کہنے کا یارا ہے تو انہیں اہلِ فکر و نظر کی دین ہے۔

میری حیثیت تو گلدستہ کے اس بندھن کی طرح ہے جو پھولوں کو یکجا باندھے رکھتی ہے۔

ہاں ! ایک بات ضرور عرض کرنی ہے مجھے اقبال اکیڈیمی کی صدارت مجبوراً قبول کرنی پڑی۔ معاملہ یہ تھا کہ ''کبرنا موت الکبائر'' (یعنی بڑوں کی موت نے مجھے بڑا بنا دیا) ایک اعزاز مجھے حاصل رہا، جس پر مجھے فخر ہے۔ وہ اقبالیات پر ایک معتبر کتب خانہ کی تنظیم ہے اس کتب خانہ سے وابستگی کچھ جذباتی سی ہے۔ آنے والوں سے میری گذارش ہے کہ وہ اس ذخیرہ کی نہ صرف حفاظت کریں بلکہ کتابوں میں اضافہ اور کتب خانہ کی تنظیم اور توسیع پر توجہ فرمائیں۔

اس سلسلہ میں ایک اور بات عرض کرنی ہے کہ مجھے گوارا نہیں تھا کہ اس کتاب کی اشاعت کا خرچہ اقبال اکیڈیمی برداشت کرے۔ میری اس خواہش کی تکمیل اس طرح ہوئی کہ میرے چھوٹے بھائی ڈاکٹر محمد مجیب الدین ایم۔ڈی (امریکہ) جو چھ ماہ قبل امریکہ سے آئے ہوئے تھے' ملاقات کے دوران انہوں نے ان مضامین کی اشاعت پر توجہ دلائی۔ ان کے ذہن میں اقبال اکیڈیمی کے قیام سے قبل شعور میں شائع ہونے والے مضامین بھی تھے۔

پتہ نہیں یہ بات ازراہِ محبت تھی یا ان کی نظر میں ان مضامین کی کچھ وقعت بھی تھی۔ میرے ابتدائی دور کے مضامین جو ان کی نظر سے گذرے تھے۔ کچھ فراہم ہو سکے اور کچھ دستیاب نہ ہو سکے۔ بہر حال انہوں نے اس کتاب کی اشاعت کی مالی ذمہ داری قبول کی اللہ پاک انہیں جزائے خیر عطا فرمائے۔

شاید اس بات کا تذکرہ بے محل نہ ہوگا کہ اقبال پر لکھتے ہوئے یہ بات پیشِ نظر رہی کہ اقبال کو اپنے دور کے حالات اور تقاضوں کی روشنی میں سمجھا جائے کہ اقبال ہمارے لئے کس حد تک بامعنی ہیں۔

اس لئے میرے مخاطب زیادہ تر طلبا و نوجوان رہے۔

ایک بات اور! کہوں یا نہ کہوں 1986ء میں اقبال صدی تقاریب کے دوران بعض احباب کے ہاتھوں کچھ ناگوار باتوں کو بھی برداشت کرنا پڑا۔ شاید ان باتوں کا دل پر اثر تھا کہ اس دوران اقبال میرے خواب میں دو مرتبہ تشریف لائے۔

اقبال اکیڈیمی سے وابستگی کے دوران شروع سے یہ کاوش رہی کہ شہر کے اہلِ نظر کو اقبال

اکیڈیمی اور کلامِ اقبال سے جوڑے رکھوں تا کہ اُن حضرات کی ژرف نگاہی سے اقبال فہمی اور اقبال شناسی کی نئی نئی راہیں کھلیں اور کلامِ اقبال کا فیض نوجوان نسل تک پہنچے۔

چھوٹا منھ اور بڑی بات ہوگی لیکن یہ شعر پیش کرنے کو جی چاہتا ہے۔

گرچہ از نیکاں نیم ، خود را بہ نیکاں بستہ ام
در ریاضِ آفرینش رشتہ گلدستہ ام

☆

''جب ہم اقبال کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہیں تو اسلوب بیان کی دلکشی، صوتی آہنگ کا اعجاز، الفاظ کا قرینہ و انداز، ایک محویت کی سی کیفیت طاری کر دیتے ہیں۔ شدت تاثر کی اس منزل سے آگے نئی تراکیب و تشبیہات' نئے استعارات اور علائم کی ایمائیت، رمزیت، اور اشارت، معانی و مفاہیم کی بے پناہ وسعتوں اور گہرائیوں میں پہنچا دیتی ہے اور پھر تاریخی اور عصری شعور کی شائستہ عکاسی اقبال کی خلاق اور توانا فکر کو اپنے عہد کے لئے بامعنی بنا دیتی ہے اس سے آگے ایک اور منزل بھی ہے جسکی جانب اقبال نے متعدد مقامات پر اشارہ کیا ہے، جہاں وجدانی سرچشموں سے سیراب ہو کر، باطن کی سرشاری و شادابی، شاعری کو حدیثِ خلوتیاں بنا دیتی ہے۔ اب یہاں وہ قاری سے جذبِ دروں اور نگاہِ شوق کے ساتھ'' یک لحظہ بہ دل درشو '' کا مطالبہ کرتی ہے۔ اس منزل پر یہ بات آشکار ہو جاتی ہے ۔

''فغانِ نیم شبی بے نوائے راز نہیں''

محمد ظہیر الدین احمد
گلشنِ خلیل، تالاب ماں صاحبہ، حیدرآباد
۲۱، اپریل، ۲۰۱۲ء

حب رسول ﷺ کے تقاضے

زندگی میں سوز و گداز، حرکت و حرارت، آرزو کی خلش اور خوب تر کی پیہم تلاش محبت ہی کے دم سے ہے۔ بلکہ ایمان، وارفتگی اور شیفتگی سے ہی عبارت ہے، ایمان کے دائرہ میں آجانا، محبت کے دائرہ میں آجانا ہے۔ ارشاد ربانی ہے ''جو ایمان لائے وہ اللہ سے نہایت درجہ محبت رکھتے ہیں۔ (والذین آمنوا اشدُّ حبا للہ) خدائے واحد پر ایمان کے ساتھ ہی رحمۃ للعالمین وخاتم النبین پر ایمان اور محبت لازمی ہے کلمہ شہادت کا دوسرا جز آنحضرت ﷺ کی عبدیت اور رسالت کا اقرار ہے۔ اس طرح ایمان کی بنیاد ہی اس ذات گرامی سے عقیدت اور محبت ہے جو نہ صرف منشائے تخلیق ہے بلکہ منتہائے تخلیق بھی ہے یعنی تمام صفات و کمالات کا مظہر اتم ہے۔

اسلام کی ساری تاریخ آپؐ کے نام لیواؤں کی عقیدت و محبت سے پُر ہے۔ اسی محبت کی لطیف کیفیات و جذبات نے نعت کی روایت ڈالی۔ درود و سلام کے مختلف دلنشین، پرسوز و پُر اثر اظہارات ایک مومن کی اسی وابستگی اور شیفتگی کا اظہار ہیں۔ یہاں جس پہلو پر غور کرنا ہے وہ یہ ہے کہ اس محبت و عقیدت کا تقاضا کیا ہے۔ حقیقی محبت خود ایک حال ہوتی ہے جو'' قال'' کی محتاج نہیں۔ محبت کسی اظہار کی تابع نہیں ہوتی۔ ہر دیکھنے والا اسے محسوس کر لیتا ہے

لیکن آج اس نازک و حساس موضوع کو'' قال'' بنا دیا گیا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس کے مضمرات پر غور کئے بغیر ہم سہولت کے ساتھ ''حبِ'' رسول ﷺ کی بڑی بڑی باتیں کہہ جاتے ہیں۔ بلکہ اتباع سنت و اطاعت کے نام پر ہی ایسی باتیں ہوتی بھی ہیں جو حضور ﷺ کے نام لیواؤں میں محبت کو نہیں نفرت کو جنم دیتی ہیں۔ نیتوں کی بات، دل کا بھید تو اللہ ہی جانے لیکن اس سے زیادہ محرومی و بدنصیبی کی بات کیا ہو سکتی ہے کہ درود و سلام کی بات برسرِ عام نزاع کی وجہ بن جائے، جزوی و فروعی مسائل میں بحث و جدال اتنا بڑھ جائے کہ اسوۂ حسنہ ہی نظروں سے اوجھل ہو جائے۔

پیغمبروں کی پاکیزہ زندگیوں کے بارے میں افراط وتفریط کے نتائج دیکھنا ہو تو صرف یہود ونصاریٰ کی تاریخ کافی ہے۔ایک گروہ نے ظاہر اور کتاب کے پہلو پر اتنی شدت اختیار کی کہ پیغمبر کی ذات اوجھل ہوگئی۔اور دوسرے گروہ نے پیغمبر کی ذات کے بارے میں اتنا غلو کیا کہ اصل پیام ہی گم ہوگیا۔اسی افراط وتفریط کی کچھ کیفیات ہماری امت کے اندر بھی کہیں درود وسلام کے نام پر ہوتی ہیں اور کبھی سنت اور اتباع کے نام پر۔نہ اتباع بلا محبت پسندیدہ ہے نہ محبت بلا اتباع مستحسن ہے۔بات دراصل یہ معلوم ہوتی ہے کہ ہم نے نہ تو رسول اللہ ﷺ کے مقام ومنصب کو سمجھا ،نہ آپ کی دعوت کے منشاء ومقصد کو جانا اور نہ آپ کی امت کے ایک فرد کی حیثیت سے اپنے آپ کو پہچانا،اس منصب اور اس کی ذمہ داری کا جب احساس ہوتا ہے تو بڑے سے بڑے اہلِ دل بھی کانپ اٹھتے ہیں کہ کیا انہیں واقعی اپنی محبت کے اظہار کا حق ہے۔

ایک بزرگ سے ان کے ایک ارادت مند نے عرض کیا کہ سرکار! مجھے ایسا وظیفہ بتادیجئے کہ خواب میں حضور اکرمؐ کے دیدار سے مشرف ہوسکوں ان بزرگ نے جواب دیا آپ کا بڑا حوصلہ معلوم ہوتا ہے۔ہم تو اپنے آپ کو اس قابل بھی نہیں سمجھتے کہ گنبدِ خضراء کا ہی دیدار ہو جائے ۔یہی وجہ ہے کہ اقبال جیسے عاشقِ رسولؐ نے کہا ہے کہ: جب میں درود پڑھتا ہوں تو میرا وجود شرم سے پانی پانی ہو جاتا ہے اور عشق یہ طعنہ دیتا ہے کہ تو، تو محکوم غیر ہے، ذرا اپنے دل پر نظر کر کہ کتنے بت براجمان ہیں ، جب تک اس ذاتِ گرامی کے رنگ کا پرتو تیرے اندر پیدا نہ ہو جائے اس وقت تک اس نام مبارک کو اپنی زبان پر لانے کی جرأت نہ کر

چو بہ نام مصطفیٰؐ خوانم درود
از خجالت آب می گردو وجود
عشق می گوید کہ اے محکوم غیر
سینۂ تو از بتاں مانندِ دیر
تانداری از محمدؐ رنگ وبو
از درودِ خود میالا نامِ اُو

محبت کے تقاضے کو سمجھنا ہو تو اس ذاتِ گرامی سے ہماری نسبت اور ربط کی معنویت کو سمجھنا

ہوگا۔ آپ ایک ایسے وسیع، عالمگیر اور ہمہ جہتی انقلاب کے بانی ہیں جو صرف ماضی سے متعلق نہیں بلکہ جس کا سلسلہ جاری ہے۔ ہم سب کا ایقان ہے کہ آپ کا اسوۂ حسنہ ابدی ہدایت کا سرچشمہ ہے۔ یہ اسی ہدایت کا فیضان ہے کہ بہ حیثیت امت ہمارا مقام، ''شهداء علی الناس''، کا ہے جب کہ آپ ﷺ کی ذات گرامی، ''یکون الرسول علیکم شهیدا'' کے اعلیٰ وابدی مقام پر ہے۔ گویا آپؐ کی ذات سے نسبت وربط اور شیفتگی اور محبت کا بنیادی تقاضا ہے کہ ہم میں اپنے منصب سے آگاہی اور باخبری کا احساس تازہ ہے۔ ''اور شهداء علی الناس'' کے زمرہ میں شامل ہو کر ساری انسانیت کی تشکیل پر اثر انداز ہوں۔ اسی پس منظر میں اتباع اور اطاعت کا مفہوم بھی واضح ہوتا ہے، یہ رسول اللہ کی اتباع ہی ہے جو اللہ سے محبت کرنے والے کو اللہ کا محبوب بھی بنا دیتی ہے۔ ''ان کنتم تحبون الله فاتبعونی یحببکم الله'' ایک مومن کے لئے اس سے بڑھ کر عزت وافتخار کی کون سی بات ہوسکتی ہے کہ محبّ، محبوب بھی بن جائے لیکن اس کی شرط اتباع رسولؐ ہی ہے۔ یہ بات ضرور ہے کہ اس اتباع میں جب محبت شامل نہ ہو تو یہ نہ صرف میکانکی بن جاتی ہے بلکہ روح سے عاری ہو جاتی ہے۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ ذاتِ رسالت مآبؐ سے محبت ہمیں آپؐ کے لائے ہوئے پیام کو جاری وساری کرنے کی امانت سے بھی مربوط کر دیتی ہے۔

جہاں تک انفرادی زندگی میں سنت کی پیروی اور اتباع کا سوال ہے ہر چاہنے والا یہ چاہتا ہے کہ اس کے ظاہر پر بھی محبوب کا رنگ چڑھ جائے، اگر ظاہر میں محبت اور عشق کا جذبہ کارفرما ہے تو یہ نہ صرف قابل احترام ہے بلکہ اس پر کلام بھی سوئے ادبی ہے۔ لیکن یہی سب کچھ نہیں ہے بلکہ سنت کی اتباع اور سنت کی پیروی کے وسیع مفہوم اور اس کے مضمرات کو نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیے رسولِ اکرمؐ کا ارشاد ہے: جس نے سنت کو زندہ کیا اس نے مجھے زندہ کیا۔ اور جس نے مجھے زندہ کیا، اس نے محبت کی مجھ سے، اور جس نے مجھ سے محبت کی وہ جنت میں میرے ساتھ رہے گا۔ یہاں پھر میں یہ عرض کروں گا کہ ایک ابدی پیام کو نہ صرف پیش کرنے والی بلکہ اسے عملی زندگی میں برپا کرنے والی برگزیدہ ہستی کی سنت کو زندہ رکھنے کا کیا مفہوم ہے؟ جب تک کہ سنت نہ صرف ہماری روحانی زندگی بلکہ تاریخی عمل سے مربوط نہ ہو جائے۔

شاید یہ بات قرآن مجید کی اس آیت سے واضح ہو جائے جہاں اللہ کی محبت اور رسول کی محبت کو جہاد فی سبیل اللہ سے مربوط کر دیا گیا ہے۔ ''آپ کہہ دیجئے کہ اگر تمہارے باپ، بیٹے،

بھائی، بیویاں اور خاندان اپنا جمع کردہ مال، وہ تجارت جس کی کساد بازاری سے تم ڈرتے ہو اور وہ گھر جنہیں تم پسند کرتے ہو۔ اللہ، اس کے رسول اور اس کے راستے میں جہاد سے زیادہ محبوب ہیں تو انتظار کرو کہ اللہ اپنا فیصلہ لائے''۔

گویا جہاد یعنی اس بات کی اہلیت اور قابلیت ہے کہ ہر اعتبار سے اس ابدی پیام کو دنیا کی زندہ حقیقت بنا دیا جائے یہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی محبت سے مربوط ہے۔ یہی ''لذت آشنائی'' ہے۔ جو مومن کو دو عالم سے بیگانہ کر دیتی ہے۔ اور شہادت'' اقبال کے الفاظ میں ''دوست کی طرف'' سفر بن جاتی ہے۔

جنگِ مومن چیست ہجرت سوئے دوست
ترکِ عالم اختیار کوئے دوست

بات محبت کی ہو اور اس کا سلسلہ جہاد تک چلا جائے، شاید کچھ بے محل سی معلوم ہو۔ لیکن کیا یہ محبت کا تقاضا ہو سکتا ہے کہ محبوب سے دشمنی اور اس کے پیام کی کھلی مخالفت کو روا رکھا جائے۔ اگر کوئی اسے قاہری کہتا ہے تو مجھے اقبالؔ کے حوالہ سے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ یہ قاہری بھی محبت کی آفریدہ ہوتی ہے''مومن از محبت قاہر است'' محبت کا کمال یہی ہے کہ محبوب کے دشمنوں سے کسی صلح کو روا نہ رکھا جائے، شیفتگی اور وارفتگی، چاپلوسی اور شر کی قوتوں سے کسی سمجھوتہ بازی پر آمادہ نہیں کر سکتی۔

شاید یہ بات تو اونچے درجہ اور عزیمت کی ہے لیکن کیا اس سے کم درجہ میں محبت کا تقاضا غیرت اور حمیت نہیں ہے۔ صحابہؓ کرامؓ کی زندگیاں راہ محبت مین عزیمت اور استقامت کی اعلیٰ منزلیں ہیں۔ لیکن اس کے بعد کی تاریخ میں ایسے قابلِ فخر نمونے مل جاتے ہیں جو محبت کے نتیجہ میں غیرت اور حمیت کی آئینہ دار ہیں۔ سر سید پر مذہبی حلقوں کی جانب سے کیا کیا نہ اعتراضات کئے گئے۔ سر ولیم میور کی کتاب میں حضور اکرم ﷺ کے بارے میں قابلِ اعتراض باتیں پڑھنے کے بعد سر سید کی غیرت و حمیت جوش میں آ گئی۔ اور ان عالمان ذی احترام سے اس کا جواب نہ بن پڑا جو سر سید کو دہریہ، نیچری، کرستان اور نہ جانے کیا کیا کہتے تھے۔ اس کتاب کا جواب لکھنے میں جو صعوبت اور تکلیف سر سید نے برداشت کی اس کا تذکرہ چھوڑیئے سوال صرف یہاں اتنا ہے کہ کیا ان لوگوں کا دعویٰ محبت جو اسلام اور اس کے رسولؐ کے نام پر کفر کا فتویٰ دیتے رہے، سر سید کی

غیرت اور حمیت کی برابری کر سکتا ہے؟ کیا محبت آپؐ کے لائے ہوئے پیام اور حق کی مظلومیت کو گوارا کر سکتی ہے اور آپؐ کے نام لیواؤں پر ظلم وستم کو برداشت کر سکتی ہے؟

محبت اور عشق کے راستے میں غیرت اور حمیت کی ایک مثال، اقبال کی زندگی میں پیش آنے والے دو واقعات میں بھی ملتی ہے، جس کا اظہار اقبالؔ کی نظم ''لاہور اور کراچی'' میں ہوا ہے۔ لاہور کے ایک نوجوان غازی علم الدین کی غیرت سرکار دو عالمﷺ کی شان میں گستاخی کرنے والے کے وجود کو برداشت نہ کر سکی اور اس غیرت کے نتیجہ میں اس نے موت کو گلے سے لگا لیا۔ اسی طرح ایک واقعہ عبدالقیوم نامی ایک اور نوجوان سے پیش آیا جو کراچی میں وکٹوریہ گاڑی چلاتا تھا۔ جب اسے موت کی سزاء سنائی گئی تو اس نے جج سے مخاطب ہو کر کہا۔ جج صاحب! میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ مجھے موت کی سزا دی۔ یہ ایک جان کس گنتی میں ہے اگر میرے پاس دو لاکھ جانیں بھی ہوتیں تو ناموسِ رسولؐ پر نچھاور کر دیتا۔ اس سزائے موت کو عمر قید میں بدلنے کی، وائسرائے سے سفارش کرنے کے لئے کراچی کے سربراہوں کا ایک وفد اقبالؔ کے پاس آیا۔ ساری کاروائی سننے کے بعد اقبالؔ نے پوچھا۔ کیا عبدالقیوم کمزور پڑ گیا ہے؟ وفد کے ارکان نے کہا ''نہیں وہ تو اپنے اقدام کا اقبال کرتا ہے اور کھلے طور پر کہتا ہے کہ میں نے شہادت خریدی ہے۔ یہاں اقبالؔ کا جواب بڑا پر اثر ہے۔'' جب وہ کہہ رہا ہے کہ میں نے شہادت خریدی ہے تو میں اس کے اجر وثواب کی راہ میں کیسے حائل ہو سکتا ہوں۔ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ میں ایسے مسلمان کے لئے وائسرائے کی خوشامد کروں جو زندہ رہا تو غازی ہے اور مر گیا تو شہید'' اس پس منظر میں اقبالؔ کی نظم ''لاہور اور کراچی'' کو دوبارہ پڑھیے۔

نظر اللہ پہ رکھتا ہے مسلمانِ غیور
موت کیا شئے ہے؟ فقط عالمِ معنی کا سفر
ان شہیدوں کی دیت اہلِ کلیسا سے نہ مانگ
قدر و قیمت میں ہے خوں جن کا حرم سے بڑھ کر
آہ! اے مرد مسلماں تجھے کیا یاد نہیں
حرفِ ''لا تدع مع اللہ الٰھا آخر''

محبت کا دعویٰ کرنے والوں کو یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ اسے صرف ''قال'' تک محدود نہ کر دیا جائے کیوں کہ کبھی کبھی محبت کا ثبوت ''بہ خاک وخون غلطیدن'' کی رسم ادا کر کے دینا پڑتا ہے۔ مجھے شدت احساس میں بھی یہ خیال دامن گیر ہے کہ انفرادی زندگی میں روحانی ارتقاء کی اعلیٰ منزلوں سے ہمکنار کرنے میں اس جذبۂ عشق ومحبت کو میں نظر انداز نہیں کر رہا ہوں اور نہ ایسا ہو سکتا ہے بلکہ یہاں میرا مقصد اس نسبت اور وابستگی کے دوسرے پہلو کو بھی پیش کرنا ہے کہ اس ذات ختمی مرتبتؐ کی اتباع نہ صرف ذاتِ ازلی سے رشتہ کو استوار کرتی ہے بلکہ اس کا تقاضا یہ بھی ہے کہ اپنے دور کی اجتماعی زندگی میں اس کی معنویت کو سمجھا جائے۔ محبت کا استغراق نہ صرف محبوب کی صفات وفضائل کی پیروی بلکہ اس کے پیام کے مقصد ومنشاء کی تکمیل میں آگے بڑھنا بھی ہے۔

اس سلسلہ میں ایک اور بات یہ ہے کہ خاتم النبین ﷺ کی ذاتِ گرامی سے وابستگی ہی ساری امت کے اتحاد کی بنیاد ہے آپؐ سے محبت ہی میں اس رشتہ کی استواری مضمر ہے۔ اقبالؔ نے کیا خوب بات کہی ہے۔

فرو از حق و ملت از وے زندہ است

اس کا مطلب یہ ہے کہ ملت کی حیات اجتماعیہ کا دار ومدار رسولِ اکرمؐ سے وابستگی ہی میں ہے۔ لیکن آج کیا یہ عملاً نہیں ہو رہا ہے کہ امت کے مختلف گروہوں میں جزوی اور فروعی مسائل پر اختلاف، اسی سنت کی اتباع اور محبت کے نام پر پیدا کیا جاتا ہے۔ درود وسلام کے نام پر بھی آپس میں نفرت کی دیواریں کھڑی کی جاتی ہیں، ایک دوسرے پر برسر عام طنز وطعن کو روا رکھا جاتا ہے۔ اس قسم کے اختلاف کے لئے محبتِ رسولؐ کے نام پر، اتباع سنت کے نام پر آپس میں کسی خلیج کو پیدا کرنے کی کوشش صرف دشمن طاقتوں کی مدد کر سکتی ہے۔ رمز شناس رسولؐ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے کیا اچھی بات کہی ہے۔ ''میں یہ نہیں چاہتا کہ صحابہؓ میں (فروعی مسائل پر) اختلاف نہ رونما ہوتا۔ کیوں کہ اگر فروعی مسائل میں صحابہؓ کا ایک ہی قول ہوتا تو لوگوں کو اس سے بڑی تکلیف ہوتی۔ صحابہ کرامؓ ائمہ دین تھے جن کی پیروی موجب خیر وبرکت ہے اور باعثِ فلاح ونجات ہے۔ اس بناء پر اگر کوئی شخص کسی بھی صحابی کے قول پر عمل کرے گا تو اسے سنت تصور کیا جائے گا''،

رسول اکرم ﷺ سے سچے عشق اور محبت کے اعلیٰ نمونے صحابہ کرامؓ کی زندگیوں کے علاوہ اور کہاں مل سکتے ہیں لیکن اس محبت کا ثبوت، جانثاری کے جس انداز سے دیا گیا وہ قابلِ غور ہے، یہ بلالؓ تھے جن کی اذاں عشق کا ترانہ بنی، یہ صدیقؓ تھے کہ جب عتبہ بن ربیعہ نے ان کے چہرے پر پھٹے ہوئے جوتوں سے پیہم ضربیں لگائیں اور سینے پر سوار ہو کر اس قدر زدوکوب کیا گیا کہ ان کی حالت اتنی نازک ہوگئی کہ بنوتمیم کے لوگ انہیں اس حال میں ایک کپڑے میں اٹھا لائے کہ ان کی موت میں کوئی شبہ نہ تھا لیکن ہوش میں آتے ہی سب سے پہلے انہوں نے رسولِ اکرمؐ کی خیریت دریافت کی، انہیں اطمینان دلانے پر بھی چین نہ آیا اور کہا کہ خدا کی قسم میں اس وقت تک کھانے اور پانی کو ہاتھ نہ لگاؤں گا جب تک رسولِ خداؐ کے دیدار سے اپنی آنکھیں روشن نہ کرلوں، لیکن صدیقؓ کی یہی محبت اس انداز سے بھی جلوہ گر ہوئی کہ وقت آنے پر اپنی ساری دولت، اپنا سارا اثاثہ محبوبؐ کے قدموں پر نچھاور کردیا اور خود زبانِ رسالت سے اہل وعیال کے لئے کچھ چھوڑنے کے بارے میں ارشاد ہوا تو جواب ملتا ہے۔

پروانے کو چراغ، ہے بلبل کو پھول بس
صدیقؓ کے لئے ہے، خدا کا رسول بس

محبت کے نتیجہ میں یہ عمرؓ کی حمیت تھی کہ رسول اللہ ﷺ کے فیصلے سے راضی نہ ہو کر آپ سے رجوع ہونے والے شخص کا فیصلہ تلوار سے کیا۔ یہی محبت عثمانؓ کے ایثار وقربانی سے جھلکتی ہے۔ عشق کا یہی تقاضا تلواروں کی چھاؤں میں علیؓ کا بستر مبارک پر لیٹ کر لوگوں کو ''امانتیں'' پہنچا دینے کی ذمہ داری قبول کرنا ہے۔

پورے غزوات کے واقعات کو پڑھ جائے اندازہ ہوگا کہ محبت اور عشق کی بات کیسے ادا کی جاتی ہے۔ تفصیل کا موقع نہیں صرف احد کے غزوہ کو دیکھئے کے عشقِ رسولؐ میں صحابہ کرامؓ نے کس جانثاری کا مظاہرہ کیا جب دشمنوں کے دل کے دل حضور اکرم پر یلغار ﷺ کرنے لگے تو زیادؓ بن سکنؓ انصاریوں کے ساتھ حفاظت کے لئے آگے بڑھے۔ کئی انصاریوں نے اپنی جانیں قربان کردیں۔ آخری وقت زیادؓ بن سکن کو حضور اکرمؐ کے پاس اس حالت میں لایا گیا کہ وہ زخموں سے چور تھے انہوں نے آخری کوشش کر کے اپنے سر کو پائے مبارک پر رکھ دیا۔ اسی میدان کارزار میں

ایک صحابیہ اُم عمارہؓ نے تلوار کا وار اپنے کاندھے پر لے لیا۔ یہی احد کا معرکہ ہے جس میں ابودجانہؓ نے اپنی پیٹھ کو ڈھال بنا دیا۔ اور ابوطلحہؓ نے اپنے ہاتھوں سے تلواروں کے وار کو روکا۔ احد کا یہی معرکہ ہے کہ ایک سیدھا سادہ مسلمان اس سارے منظر کو دیکھ کر عرض کرتا ہے کہ اگر میں لڑتا ہوا قربان ہو جاؤں تو کیا مجھے جنت ملے گی۔ اثبات میں جواب ملنے پر یہ کہتا ہوا معرکہ میں شریک ہو جاتا ہے کہ ''اگر میں نے ان کھجوروں کو کھانے کی مہلت پالی تو بڑی عمر پالی''۔ سعد بن ربیعؓ کی تلاش کی جاتی ہے وہ زخموں سے چور جاں بلب ہیں، دربارِ رسالتؐ میں سلام شوق پہنچانے کی گذارش کرتے ہوئے اپنے ساتھیوں کو یوں متنبہ کرتے ہیں کہ تم میں ایک آنکھ بھی دیکھنے والی موجود ہوئی اور رسول اللہ ﷺ تک دشمن کے ہاتھ پہنچ گئے تو یاد رکھو کہ بارگاہِ الٰہی میں کوئی عذر سنا نہ جائے گا۔ احد ہی کی بات ہے کہ ایک صحابیہؓ کو ان کے باپ، بھائی اور شوہر کی شہادت کی اطلاع دی جاتی رہی لیکن ہر حادثۂ جانگداز کو سننے کے بعد ان کی زبان پر یہی سوال تھا کہ ''رسول اللہؐ کیسے ہیں؟ جب آپؐ کی خیریت کی اطلاع دی جاتی ہے تو فرماتی ہیں کہ آپ کے ہوتے ہوئے ساری مصیبتیں ہیچ ہیں۔

ان مثالوں سے بات کو طوالت دینا مقصود نہیں بلکہ صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ محبت، اتباع اور اطاعت کا اظہار کس انداز سے کیا گیا۔ اور اس کے حقیقی تقاضے کیا ہیں۔

☆☆☆☆☆

عبدہٗ ورسولہٗ ﷺ

اشھد ان محمدا عبدہٗ ورسولہٗ (میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اللہ کے عبد اور رسول ہیں، کلمہ شہادت کے دوسرے جزو میں حضور اکرمؐ کی ذات گرامی کے بارے میں عبدہٗ ورسولہٗ، کے ان دو پہلوؤں کی شہادت بڑی بلیغ اور معنی خیز ہے۔ یہ سوال بڑا اہم ہے کہ اس شہادت کی معنویت کیا ہے؟ اس لئے کہ یہ گواہی نہ صرف آپؐ کی شخصیت کے مرتبہ ومقام کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے بلکہ اس عظیم اور دوامی اسوہ حسنہ کے بارے میں ہمارے ذہنی رویہ کو بھی متعین کرتی ہے، اور خود دین کی تعبیر اور تفہیم میں یہ گواہی بڑی معنویت کی حامل ہے۔ دوسری طرف یہ شہادت ہمیں اس ذمہ داری سے بھی آگاہ کرتی ہے جو بہ حیثیت شاہد ہم قبول کرتے ہیں۔ اس لئے اس بات کا سمجھنا ہمارے لئے ضروری ہے کہ حضور اکرم ﷺ کے مقام عبدیت اور مقام رسالت کے ان دو پہلوؤں کی شہادت کا مفہوم اور اس کے تقاضے اور مطالبات کیا ہیں؟

تاریخ مذاہب کا مطالعہ ہمیں اس غیر متوازن صورت حال سے روشناس کراتا ہے جو انبیائے کرام کی شخصیتوں کے بارے میں افراط اور تفریط کا نتیجہ ہوتا ہے، شاید یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ کسی نہ کسی انداز میں خود ہمارے اندر ایسے رجحانات درآئے ہیں جو ہمیں راہ اعتدال سے ہٹا دیتے ہیں اس کی وجہ یہی ہے کہ اس مکمل ترین شخصیت کے ان روحانی اور تاریخی بُعد اور ان کے درمیان ربط کو ہم پوری طرح سمجھنے سے قاصر رہ جاتے ہیں ایک طرف تو ڈانڈے الوہیت سے اس طرح ملا دیئے جاتے ہیں کہ اس کا تاریخی اور ارضی مفہوم نظر انداز ہو جاتا ہے۔ دوسری طرف سیرتِ طیبہ کے صرف تاریخی پہلو پر ہماری توجہ اس حد تک مرکوز ہو جاتی ہے کہ روحانی پہلو نظروں سے اوجھل رہ جاتا ہے۔ بات شاید یوں واضح ہو کہ حضورِ اکرمؐ کی شخصیت کا ایک بُعد عبدیت کا ہے جو حقیقت کے ازلی اور ابدی سرچشمہ سے مربوط کرتا ہے تو شخصیت کا دوسرا بُعد تاریخی بعد ہے جو عالم انسانیت سے منسلک کرتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں ایک تعلق مع اللہ ہے اور دوسرا تعلق مع الخلوق ہے۔ ان دو پہلوؤں کو ہمیں اس ذات گرامیؐ کے spiritual

اور Historical Dimensions بھی کہہ سکتے ہیں، لیکن یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ یہ دو پہلو علیحدہ نہیں بلکہ باہم مربوط ہیں اسی ربطِ باطنی کا استحضار اس اسوۂ حسنہ کی پیروی کے لئے ضروری ہے۔

یوں تو قرآن مجید میں جگہ جگہ آپ کی صفات و کمالات، منشائے بعثت اور منصب رسالت کا تذکرہ متعدد مقامات پر کیا گیا ہے، لیکن میں یہاں صرف دو چار آیتوں کی طرف اشارہ کروں گا جو آپؐ کے مقام عبدیت کو واضح کرتی ہیں۔ سورہ بنی اسرائیل کے آغاز میں معراج نبویؐ کے سلسلہ میں ارشاد ہوا ''سبحان الذی اسریٰ بعبدہ''۔ روحانی کمالات اور قربِ الٰہی کی اس اعلیٰ ترین منزل پر عبدیت کا اشارہ بڑا معنی خیز ہے۔ اسی طرح معراج ہی کے سلسلہ میں سورہ نجم میں یوں ارشاد ہوا۔ ''فاوحیٰ الیٰ عبدہ ما اوحیٰ''۔ اسی سورہ کی اور آیتوں پر غور ہمیں اس حقیقت تک رسائی میں مدد دیتا ہے کہ مقام عبدیت حقائق کبریٰ کی یافت آیات سماوی کے مشاہدات اور قربِ الٰہی کی اعلیٰ ترین منزل تک رسائی سے عبارت ہے) یہاں عبدیت کاملہ کی قرآن مجید یوں شہادت دیتا ہے کہ مازاغ البصر وما طغیٰ۔ (نگاہ نہ تو ہٹی اور نہ بڑھی)

وحی الٰہی اور تنزیل آیاتِ بینات کے سلسلے میں بھی عبدہٗ کے پہلو ہی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ''ھو الذی ینزل علیٰ عبدہ آیات بینات'' ایک اور مقام پر فرمایا گیا تبارک الذی نزل الفرقان علیٰ عبدہ۔

عارفین نے کہا ہے کہ حضور اکرمؐ کی ذات گرامی سرِ تخلیق ہے۔ مظہر لولاک ہے۔ وجہ تکوین ہے، جوہر کائنات ہے، جاوید نامہ میں فلک مشتری پر حلاج کی زبانی ان اسرار کی طرف یوں اشارہ کرتے ہیں۔

عبدہ، از فہم تو بالا تر است
زانکہ او ہم آدم وہم جوہر است

کس ز سرِّ عبدہٗ آگاہ نیست
عبدہ جز سرِ الا اللہ نیست

مدعا پیدا نگردد زیں دو بیت
تا نہ بینی از مقامِ ''مارمیت''

اسی سلسلہ میں اقبال نے یوں بھی کہا ہے۔''نگاہ عشق و مستی میں وہی اول وہی آخر۔''
وہی ابتداء بھی ہے وہی انتہا بھی ہے گویا تخلیق اور تکوین کی ابتداء حقیقتِ محمد یہؐ ہے اور اس کی انتہا رسالتِ محمد یہؐ ہے۔ایک بزرگ نے اس کی مزید تشریح یوں کی ہے کہ مختلف انبیاء کا ظہور در اصل مدارجِ محمد یہ کا ظہور ہے۔آپ کا وجود مبارک آیہ کائنات کا معنی دیریاب ہے۔

اب مقام عبدہٗ کی اس روشنی میں سیرتِ طیبہ کو دیکھئے کہ ہر آن اللہ سے رشتہ استوار ہے، حقیقت اور صداقت کے سرچشمہ سے ربطِ کامل ہے۔ایمان و یقین کی پختگی، تسلیم و رضا، سپردگی و تفویض کا معاملہ ہے۔اس شان عبدیت کا استغراق و انہماک اور بندگی کا سوز و ساز، کا مظہر یہ ارشاد گرامی ہے کہ کیا میں اپنے رب کا شکر گزار بندہ نہ بنوں۔ایک حدیث شریف کے یہ چند بلیغ فقرے اس مقام عبدیت کی مزید وضاحت کرتے ہیں۔''**المعرفة راس مالی**'' (معرفت میرا راس المال یعنی اصل پونجی ہے) ''**والحب اساسی**'' (محبت میری بنیاد ہے) ''**والشوق مرکبی**'' (شوق میری سواری ہے) **ذکر اللہ انیسی** (ذکر الٰہی میرا انیس ہے) نواب بہادر یار جنگ کا یہ شعر اس حقیقت کی ترجمانی کرتا ہے۔

اے کہ ترا سرِ نیاز حدِ کمال بندگی
اے کہ ترا مقامِ عشق قربِ تمامِ عینِ ذات

اب آیئے دوسرے پہلو کی طرف جو تکمیل رسالت کا ہے۔کمال بندگی اور قربِ تمام عین ذات کے ساتھ ساتھ مخلوق یعنی عالم انسانیت سے رشتہ استوار ہے۔منصب رسالت کے بارے میں قرآن میں یوں ارشاد ہوا''**ھو الذی ارسل رسوله بالھدیٰ و دین الحق لیظھره علی الدین کله**'' (اللہ نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ مبعوث فرمایا کہ اس کو تمام ادیان پر غالب کر دیا جائے)۔اس تاریخی عمل کی بنیاد انسانیت کے لئے غم خواری و دل سوزی ہے، رحمت اور رافت ہے جس کی شہادت یوں دی گئی ہے۔آپ کے قلب مطہر پر انسانوں کی تکلیف نہایت شاق گزرتی ہے، جو ان کی فلاح اور نجات کا حد درجہ شائق ہے (**لقد جاء کم رسول من انفسکم عزیز علیه ما عنتم حریص علیکم ، بالمومنین رؤف رحیم**) اور اس رسالت کا منشاء یہی ہے کہ انسانیت کو ہر بوجھ سے نجات اور طوق و سلاسل سے چھٹکارا دلا کر اسے معبود حقیقی سے روشناس کرایا جائے۔

رسولہٗ کی گواہی کے اس مفہوم کو سمجھنا ہو تو آپ حیاتِ طیبہ میں اس تڑپ اور دل سوزی، محنت ومشقت، شدائد اور مصائب پر نظر ڈالیں، جو آپؐ نے انسانیت کو جادۂ برحق پر گامزن کرنے کے لئے برداشت فرمائیں۔ سیرت نگار غزوات کی تعداد ۲۷ بتاتے ہیں اور چھوٹے اور بڑے سرایا کی تعداد ۳۵ تا ۶۷ بتائی گئی ہے۔ اگر کم از کم تعداد ہی لی جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اوسطاً ہر دو ماہ کے عرصہ میں ایک جنگی مہم کا سامنا کرنا پڑا وہ ذات گرامی جو وجہ تخلیق ہے، اس کی سچائی اور امانت کی تصدیق کے باوجود اس کی دعوت کو رد کیا جا رہا ہے۔ وہ جو سرورِ کونینؐ ہے احد میں زخمی ہو رہا ہے، حنین میں تیر اندازوں کا نشانہ ہے وہ جو عبدِ کاملؐ ہے، شعب ابی طالب میں محروس ہے۔ عام الحزن بھی ہے، وادی طائف میں غم واندوہ کی معراج بھی ہے۔

میں نے ابتداء میں عرض کیا تھا کہ عبدہٗ ورسولہٗ کی اس شہادت کے ساتھ ان دو پہلوؤں کے درمیان باطنی اتحاد وربط، تطبیق وتوافق کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ اس ربط کو سمجھنے میں عصری اسلامی فکر میں اقبال ہمارا ساتھ دیتے ہیں وہ پانچویں خطبہ میں کہتے ہیں نبوت کی تعریف یوں کی جاسکتی ہے کہ یہ شعور ولایت کی وہ شکل ہے جس میں واردات اتحاد (یعنی روحانی تجربہ) اپنے حدود سے چھلک کر ان قوتوں اور وسائل کو بروئے کار لاتا ہے جو حیات اجتماعیہ کی صورت گر ہیں گویا انبیاء کی ذات میں زندگی کا متناہی مرکز، لامحدود اعماق میں ڈوب جاتا ہے تو اس لئے کہ پھر ایک تازہ قوت اور توانائی سے ابھر سکے۔ وہ ماضی کو مٹانا اور پھر زندگی کی نئی راہیں اس پر منکشف کر دیتا ہے، معراج کے سلسلہ میں شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے ایک قول کو پیش کرتے ہوئے اقبال کہتے ہیں کہ روحانی تجربہ کے بعد نبی کی باز آمد یا مراجعت تخلیقی ہوتی ہے، وہ اس واردات روحانی سے واپس آتا ہے تو اس لئے کہ زمانہ کی رو میں داخل ہو جائے اور ان قوتوں کے غلبہ وتصرف سے جو تاریخ عالم کی صورت گر ہیں مقاصد کی ایک نئی دنیا آباد کرے۔

عبد کاملؐ کے ان لمحات پر نظر ڈالئے جب روح پاک عالم قدس میں پہنچنے کو ہے، سانسوں کی خرخراہٹ کے درمیان لب مبارک کو جنبش ہے، فدائیان رسول قریب پہنچ کر آواز سنتے ہیں، ''الصلوٰۃ وما ملکت ایمانکم'' یعنی وقت وداع بھی ان دو پہلوؤں کا اظہار ہے۔ ایک طرف صلوٰۃ کی تاکید ہے جو عبودیت کا اعلیٰ ترین اظہار ہے، مومن کی معراج ہے۔ دوسری طرف ان لوگوں کے حقوق ادا کرنے کی تاکید ہے جن پر آپ کو غلبہ حاصل ہے، آخری الفاظ ''رفیق الاعلیٰ'' کے ہیں عبد کاملؐ کے لئے رفیق اعلیٰ سے بڑھ کر کون سی رفاقت ہو سکتی ہیں۔ میں نے ابتداء میں یہ بات بھی عرض کی تھی کہ عبدیت

اور رسالتِ محمدیہ کی شہادت دیتے ہوئے ہم بہ حیثیت شاہد ایک ذمہ داری قبول کرتے ہیں۔ ایک طرف تو عبدہٗ کی پیروی میں روحانی اور اخلاقی کمالات کا نہ ختم ہونے والا سفر ہے۔ ذوق وشوق و بندگی ہے تو دوسری طرف رسولہٗ کی گواہی کے بعد ہم اپنے عصر، اپنے معاشرہ، اپنے ماحول سے بیگانہ اور بے نیاز نہیں رہ سکتے اس شہادت کا تقاضا ہے کہ ہم خیر کی جستجو میں عالم انسانیت کے بہتر مستقبل کی صورت گری کے لئے ایک فعال قوت بن جائیں، ایک مشہور صوفی بزرگ کا یہ قول غور وفکر کا طلب گار ہے کہ سالک، مقاماتِ سلوک طے کرنے کے بعد مخلوق کی طرف مامور من اللہ ہو جاتا ہے سوال یہی اہم ہے کہ روحانی پیشوائی کا دعویٰ کرنے والوں کے سامنے اللہ کی طرف سے مخلوق کی جانب ماموریت کا تصور کس حد تک متحضر ہے۔ آج ہماری ملی زندگی کا المیہ یہی ہے کہ ایک طرف تو ایمان اور یقین کی باتیں ہیں کمالات اور کرامات کے تذکرے ہیں لیکن جہانِ مکافاتِ عمل کو اوروں کے لئے چھوڑ دیا گیا ہے۔ شائد اسی پس منظر میں اقبال نے کہا

یہ حکمتِ ملکوتی یہ علمِ لاہوتی
حرم کے درد کا درماں نہیں تو کچھ بھی نہیں
یہ ذکر نیم شبی یہ مراقبے یہ سرور
تری خودی کے نگہباں نہیں تو کچھ بھی نہیں

ایک طرف ملّی قیادت کا دعویٰ کرنے والوں کا ایک گروہ ایسا بھی ہے جن کی نظروں سے اظہار عبودیت کے تقاضے اوجھل ہیں خوفِ خدا، اخلاص، بے نفسی کی کیفیت نہیں ملتی، للّٰہیت نہ ہو تو ہم اپنی ہوائے نفس کو اپنا معبود بنا لیتے ہیں، جماعتیں بت بن جاتی ہیں، مفاداتِ حاصلہ ہمارا مقصود بن جاتے ہیں اور ہم اپنے نفس کے مغالطوں کا شکار ہو کر اپنے مقصد سے دور ہو جاتے ہیں، مرضئ الٰہی کو نظروں سے اوجھل کر دیتے ہیں اخلاص اور بے نفسی کے بغیر مخلوق کی خدمت کا دعویٰ خودنمائی، شہرت پسندی اور ہوائے نفس کی پیروی کے سوا کچھ اور نہیں۔

اسی طرح روحانی کمالات اور پیشوائی، تعلق مع الخلق سے کٹ کر شاید رہبانیت ہی قرار دی جاسکتی ہے، خلوت کا سرور اگر جلوت سے بے نیاز کر دے، اگر مراقبہ ہی مقصود بن جائے اور مجاہدہ سے سروکار نہ رہے تو گویا ہم رسولہٗ کی شہادت کے تقاضوں سے غفلت کا شکار ہو رہے ہیں، جمال و فقر شانِ

عبدیت کا فیض ہے اور جلال و غلبہ شان رسالت سے مستنیر ہے۔

فقر و شاہی وارداتِ مصطفیٰ است
ایں تجلی ہائے ذاتِ مصطفیٰ است
ایں دوقوت از وجودِ مومن است
ایں قیام و آں سجودِ مومن است

سجدہ میں جمال بندگی ہے اور قیام جلال کبریائی کا مظہر ہے ۔اگر وقتِ قیام ہم سجدہ میں گر جاتے ہیں تو گویا ہم عالم انسانیت سے کٹ جانے کی غلطی کا ارتکاب کرتے ہیں اور قیام کی استقامت اور جلال کے بغیر سجدہ شاید سر بزیری بن کر رہ جاتا ہے۔ حرا کی خلوتوں سے لے کر فاران کی چوٹی پر نعرہ حق تک، خودی سے بے خودی تک مختلف منزلوں اور مراحل کی نشاندہی اقبال نے کمال بلاغت سے یوں کی ہے۔

اندکے اندر حرائے دل نشین
ترکِ خود کن سوئے حق ہجرت گزیں
محکم از حق شو سوئے خود گامزن
لات و عزائے ہوس را سرشکن
لشکرے پیدا کن از سلطانِ عشق
جلوہ گر شو بر سرِ فارانِ عشق
تا خدائے کعبہ بنوازد ترا
شرحِ انّی جاعلٌ سازد ترا

غرض ہمارے انفرادی اور اجتماعی تقاضوں کی تکمیل اسی وقت ہو سکتی ہے۔ جب حضور اکرم ﷺ کی ذات گرامی کی عبدیتِ کاملہ اور رسالتِ کاملہ کے دونوں پہلو ہمارے سامنے ہوں اور ہم روحانی اور تاریخی ابعاد اوران کے درمیان ربط اور تطبیق کے رمز شناس بن سکیں

خودی کی خلوتوں میں کبریائی
خودی کی جلوتوں میں مصطفائی

مطبوعہ سوویتز ۱۹۸۶ء

☆☆☆

سبق ملا ہے یہ معراج مصطفیؐ سے مجھے

(یوم رحمۃ للعالمین ۱۹۷۹ء میں کی گئی ایک تقریر کی تلخیص)

معراج مصطفویؐ نہ صرف تاریخ اسلام بلکہ ساری انسانیت کا ایک عظیم انقلاب آفریں واقعہ ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل کی ابتدائی آیات اور سورۂ نجم سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضور اکرم ﷺ بغیر کسی مادی وسائل کے مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک تشریف لے جاتے ہیں۔ روشنی سے زیادہ سبک خرام سواری میں افلاک کی سیر فرماتے ہیں۔ آیات سماوی کا مشاہدہ فرماتے ہیں حقائق کبریٰ کی یافت ہوتی ہے۔ قرب الٰہی کی اعلیٰ ترین منزل تک رسائی ہوتی ہے۔ اس حال میں کہ قرآن مجید گواہی دیتا ہے کہ مازاغ البصر وماطغیٰ (نہ نگاہ جھپکی اور نہ نظر بھٹکی) وقت اور فاصلہ کی ناقابل تصور وسعتیں سمٹ کر ایک لمحہ اور ایک نقطہ پر مرکوز ہو جاتی ہیں۔ اس واقعہ کی کئی انداز سے تعبیریں کی گئیں لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس واقعہ عظیم کے چند اہم پہلو عموماً روایات میں گم ہیں۔ جہاں تک نبوت کے روحانی مقام کا تعلق ہے۔ عارفان اسلام نے معراج کے بارے میں اسرار و نکات بیان فرمائے ہیں۔ لیکن عموماً اس پر کم اظہار ہوا ہے کہ معراج نبویؐ کے کیا اثرات انسانی تاریخ پر مرتب ہوئے۔

نبوت کا اہم منصب تاریخ انسانی کی صورت گری ہے۔ ایک ایسی اخلاقی فضاء کی تخلیق ہے جہاں فرد اپنے کمالات کو پہنچتا ہے۔ معراج جہاں نام ہے افلاک کی تسخیر کا، زماں اور مکاں کی زنجیروں کے ٹوٹنے کا، قرب الٰہی کی اعلیٰ ترین منزل کا، وہی اس کا ایک ارضی پہلو بھی ہے جس کا زندگی اور انسانی تقدیر سے گہرا اور معنوی ربط ہے۔

اس پس منظر میں آج میری تقریر کا موضوع یہ ہے کہ معراجِ مصطفویؐ کے تہذیبی پہلو کیا ہیں؟ اس واقعۂ عظیمہ نے تمدنِ انسانی پر کیا انمٹ نقش چھوڑے ہیں اور اسلام کے سیاسی اور سماجی اظہار میں اس واقعہ کا کیا اثر ہے؟

سب سے پہلے جو بات قابل غور ہے، وہ معراج مصطفوی کا زمانی پہلو ہے، یعنی حضور اکرمؐ کی حیاتِ طیبہ کے کس مرحلہ میں یہ واقعہ پیش آیا۔ آپ جانتے ہیں کہ یہ واقعہ حضورؐ کی مکی اور مدنی زندگی کے درمیان ایک اہم کڑی ہے۔

حضور اکرمؐ نے جب صفا کی چوٹی سے حق کی آواز بلند کی تو وہی مکہ اس ذاتِ گرامی صلی اللہ علیہ وسلم کا دشمن اور مخالف بن گیا جس کو اس نے صادق اور امین کہا۔ کسی معجزہ سے زیادہ خود اس ہستی مقدس کی زندگی صداقت کا معیار تھی، تب ہی تو قرآن مجید کے الفاظ میں مکہ کے لوگوں کے سامنے یہ اعلان کیا گیا۔ ''میں نے تمہارے ہی درمیان عمر گذاری ہے۔ کیا تم عقل نہیں رکھتے ''۔ لیکن جن کے کان حق کی آواز کو سننا نہ چاہتے ہوں، جن کی آنکھیں کھلی حقیقت کو نظر انداز کرنا چاہتی ہوں اور جن کے دل حق کو قبول کرنے کی صلاحیت سے عاری ہو چکے ہوں انہوں نے مخالفت کی ہر ممکن کوشش کی۔ شخصی حملے کیے گئے، ذہنی اور جسمانی اذیتیں دی گئیں، جاں نثاروں پر ظلم وستم کے ایسے پہاڑ توڑے گئے جن کے تذکرہ سے انسانیت لرزہ براندام ہو جاتی ہے۔

معراج سے قبل مکی دور کے آخری تین سالوں میں ظلم وستم، تعذیب اور مصائب اپنی انتہا کو پہنچ جاتے ہیں ساتویں سن بعثت کے آغاز میں حضور اکرم ﷺ اپنے جاں نثاروں کے ساتھ ایک گھاٹی میں بند کر دیئے جاتے ہیں۔ بھوک اور پیاس سے بچے بلبلا اٹھتے ہیں۔ نہ صرف درختوں کے پتے بلکہ خشک چمڑے کو پاک کر کے بھون کر کھانے کی نوبت آتی ہے۔ اپنے فدائیوں کی اس تکلیف اور مصیبت کو دیکھ کر حضور اکرم ﷺ کے قلب مطہر کی کیا کیفیت ہو گی، اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ ایک مرتبہ حضور اکرم ﷺ اپنے صحابیوںؓ کے ساتھ کہیں پیدل تشریف لے جا رہے ہیں، آپ کی یہ عادت مبارکہ تھی کہ آپ قدرے تیز رفتار تھے، لیکن آپ نے اپنی رفتار سست فرمالی۔ صحابہؓ نے استفسار کیا کہ حضورؐ خلاف عادت آپ آہستہ کیوں چل رہے ہیں۔ زبانِ رسالت سے ارشاد ہوا کہ کیا تم نہیں دیکھتے کہ میرے آگے ایک بوڑھا یہودی جا رہا ہے۔ مجھے خیال ہوا کہ اگر میں تیز چلتا ہوا اس کے آگے نکل جاؤں تو کہیں اس کو اپنی عمر رفتہ یاد نہ آ جائے، کہیں وہ سوچنے پر مجبور نہ ہو جائے کہ کاش میں بھی جوان ہوتا، کاش میں بھی توانا ہوتا، کاش مجھ میں اتنی قوت ہوتی کہ میں بھی تیز چل سکتا' مجھے خیال ہوا کہ کہیں

میری تیز رفتاری سے اس بوڑھے یہودی کے دل پر چوٹ نہ پڑے حضور اکرم ﷺ کو ایک یہودی کی خاطر کا اتنا پاس ہے تو اپنے جاں نثاروں کی اس کڑی آزمائش پر آپ کے لطیف احساسات اور دلسوزی کی کیا کیفیت ہوگی؟ کوئی تین سال کے عرصہ کے بعد ابتلاء اور مصائب کا یہ دور ختم ہی ہوا تھا کہ ابو طالب کا انتقال ہو جاتا ہے۔ ابو طالب کی اخلاقی تائید وحمایت کی دشمنوں میں بڑی اہمیت تھی، ایک نہیں چار وفود سرداران قریش نے ابو طالب کی خدمت میں روانہ کئے گئے کہ آپؐ اپنے بھتیجے کی تائید سے دستبردار ہو جائیں جب قتل کی دھمکی دی گئی تو ابو طالب لڑکھڑا گئے اور پکار اٹھے، اے میرے بھتیجے مجھ پر اتنا بوجھ نہ ڈالو جسے میں سہار نہ سکوں لیکن زبان رسالت سے یہ پرعزم آواز آئی چچا جان اگر میرے ایک ہاتھ پر سورج اور دوسرے ہاتھ پر چاندر کھ دیا جائے تو بھی میں اس کام سے باز نہ آؤں گا یا تو یہ کام انجام پا کر رہے گا یا میں اپنی جان، جان آفرین کے سپرد کر دوں گا۔

اس پر استقامت اعلان کے بعد ابو طالب کی حمایت کو توڑنے کی ساری سازشیں اور تدبیریں ناکام ہو گئیں۔

ابو طالب کے انتقال کے چند دن بعد ہی حضرت خدیجہؓ داغ مفارقت دے گئیں، ان کی جدائی کا غم کوئی معمولی غم نہیں تھا، یہ وہ تھیں جنہوں نے سچی رفاقت کا حق ادا کیا، جنہوں نے اپنی ساری دولت وثروت کو حضور ﷺ کے قدموں پر نچھاور کر دیا، جنہوں نے آپ کی رسالت کی سب سے پہلے تصدیق کی یہ دو صدمات ایسے تھے کہ اس سال کو عام الحزن ''یا غم واندوہ کا سال'' بھی کہا جاتا ہے شعیب ابی طالب اور عام الحزن کے بعد سب سے بڑی آزمائش ابھی باقی ہے۔ وہ طائف کا سفر ہے، لیکن یہاں بھی کیا جواب ملا، رحمت اللعالمینؐ کے ساتھ کیا سلوک روا رکھا گیا اس کی تفصیلات کا وقت نہیں ہے۔ غنڈوں کے ایک ہجوم کو پیچھے چھوڑ دیا گیا طنز سے بھرپور دل کو مجروح کرنے والے فقرے کسے گئے، پتھر برسائے گئے اور جسم اطہر سے اتنا خون بہا کہ نعلین مبارک پیوست ہو گئے غشی طاری ہوگئی، یہ مصیبت اتنی کڑی تھی کہ آپؐ نے فرمایا طائف میں میرے مصائب میری امت کے لئے پرسہ کا کام کریں گے۔

اس کرب واضطراب کا اظہار اس دعا سے ہوتا ہے جو آپ نے طائف کی گھاٹی میں

فرمائی۔ بارگاہ ایزدی میں اس دعا کا ایک ایک لفظ حضور کی قلبی کیفیات کا آئینہ دار ہے۔ آپؐ نے یوں دعا فرمائی ''اے میرے اللہ! میں تیرے ہی سامنے اپنی بے زوری کا شکوہ کرتا ہوں تیرے ہی آگے اپنی بے سروسامانی کا گلہ کرتا ہوں، دیکھ انسانوں میں، میں کیسا ہلکا کیا گیا، لوگوں میں، میری یہ کیسی سبکی ہو رہی ہے۔ اے سارے مہربانوں میں سب سے مہربان مالک! سن، میری سن، میری قوت! اے میرے رب تو ہی ہے۔ تو مجھے کن کے سپرد کرتا ہے، کیا تو مجھے ان کے نزدیک کرتا ہے جو ہم سے دور ہوتے ہیں، کیا تو نے مجھ کو میرے سارے معاملات کو دشمنوں کے قابو میں دے دیا ہے؟ پھر بھی اگر مجھ پر تیرا غصہ نہیں ہے تو مجھے ان باتوں کی کیا پروا؟ کچھ بھی ہو، میری سمائی تیری عافیت ہی کی آغوش میں ہے اور تیرے چہرے کی وہ جگمگاہٹ جس سے اندھیرے روشنی میں بدل جاتے ہیں، میں اسی نور کی پناہ میں آتا ہوں کہ اسی میں میری دنیا اور میری آخرت کا سدھار ہے۔ مجھ پر تیرا غصہ بھڑکے، اس سے پناہ مانگتا ہوں، مجھ پر تیرا غضب ٹوٹے اس سے تیرے سایہ میں آتا ہوں، منانا ہے، اس وقت تک منانا ہے جب تک کہ تو راضی نہ ہو جائے''۔ یہ ٹوٹے ہوئے دل سے نکلی ہوئی تڑپا دینے والی دعا ہے۔ صفا کی چوٹی کا انکار طائف کی گھاٹی میں انتہا کو پہنچ جاتا ہے۔ یہ پُر سوز اور پُر درد دعا رحمتِ الٰہی کو جوش میں لا دیتی ہے، وہ جو لوگوں میں ٹھکرایا گیا، وہ جس کی دعوتِ حق کو رد کر دیا گیا اب اسے اونچا اٹھایا جاتا ہے، اتنا بلند کیا جاتا ہے کہ قربِ الٰہی کی وہ انتہائی منزل آتی ہے جس کو قرآن مجید نے ''قاب قوسین او ادنیٰ'' کے الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔

حضورؐ کی حیاتِ طیبہ میں معراج کا یہ زمانی پہلو ہمیں اس بات کا سبق دیتا ہے کہ جب آزمائش انتہا کو پہنچ جاتی ہے جب مصائب کا ہجوم ہوتا ہے، جب ظلم و ستم اپنی معراج کو پہنچ جاتے ہیں تب کہیں، معراج کا مقام آتا ہے۔

یہ زمانی پہلو حق کی راہ میں قدم رکھنے والوں کو یاد دلاتا ہے کہ آزمائش کے بعد ہی فتح و نصرت و کامرانی کی منزل آتی ہے، یہاں یہ بات یاد رہے کہ مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کے الفاظ میں کہ حضور اکرم ﷺ کے یہ مصائب اضطراری نہیں تھے بلکہ اختیاری تھے تاکہ حق کے علمبرداروں کو یہ بات سمجھا دی جائے کہ معراج و کمال کا راستہ کن منزلوں سے ہو کر گزرتا ہے۔

اب معراج کے بعد دعوت کی قبولیت اور تسخیر کا دور شروع ہوتا ہے ساری انسانیت تاریخ کے ایک فیصلہ کن موڑ پر پہنچ رہی ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل کا آغاز معراج کے تذکرہ سے ہوتا ہے لیکن یہ پورا اسوۂ معراج کے اسرار و حقائق نتائج اور احکامات پر مبنی ہے۔ یہودیوں پر یہ بات واضح کردی جاتی ہے کہ بیت المقدس پر اب ان کی تولیت کا استحقاق ختم ہونے کو ہے۔ کفارانِ قریش کے سامنے یہ اعلان ہوتا ہے کہ پند و نصائح کا زمانہ گزر گیا اب فیصلۂ حق کا وقت آتا ہے۔ ہجرت کا اشارہ اسی سورہ کی اس دعا سے ملتا ہے کہ۔

وقل رب ادخلنی مدخلَ صدقٍ واخرجنی مخرج صدق واجعل لی من لدنک سلطانا نصیرا (۱۷ : ۸۰)

یہ ارشاد ربانی نصرت و غلبہ کی بشارت لئے ہوئے ہے کہ اب باطل کا چل چلاؤ ہے۔

وقل جاء الحق وزهق الباطل ط ان الباطل كان زهوقا.(۱۷ :۸)

سچائی اب اپنی پوری معنوی اور سماجی وسعتوں کے ساتھ ظاہر ہونے کو ہے۔

معراج کے بعد بیعت عقبیٰ اولیٰ اور ثانیہ سے اس دعوت کی وسیع پیمانے پر قبولیت کا آغاز ہوجاتا ہے جس کے بعد ہی ہجرت کا مقام آتا ہے۔ جو ایک نئے انقلاب کا آغاز بنتا ہے۔ غارِ حرا کی خلوت غار ثور سے نکل کر دعوتِ حق ایک نئی سماجی تشکیل کا روپ دھارنے کو ہے۔ ہجرت کی اقبال نے ایک نئی توجیہ پیش کی ہے کہ یہ دشمنوں کے نرغہ سے فرار نہیں ہے بلکہ زمین پیوستگی کے خلاف ایک اظہار ہے۔ تسخیر کل عزم ہے، شبنم، کی تنک آبی سے نکل تسخیرِ یم کا اعلان ہے اور ثباتِ مسلم کا ایک اہم مرحلہ ہے۔

معراج کے ایک اور اہم تمدنی پہلو کی طرف اقبال نے اپنے پانچویں خطبہ میں اشارہ کیا ہے۔ اس مقام پر انہوں نے مشہور صوفی بزرگ عبد القدوس گنگوہی کے اس قول کو دہرایا ہے کہ ''محمد عربی ﷺ فلک الافلاک پر تشریف لے گئے اور واپس تشریف لے آئے خدا کی قسم میں اس مقام تک جاتا تو کبھی واپس نہ آتا۔

طاقت و توانائی کے حقیقی سرچشمہ سے قربت کے بعد ایک نبی کی اس دنیائے جہد و عمل میں واپسی اس لئے ہوئی ہے کہ ساری انسانیت کی تاریخ میں ایک انقلاب برپا کیا جائے اقبال کا

یہ شعر منصب نبوت کے ان دو اہم پہلوؤں کی بہترین عکاسی کرتا ہے

خودی کی خلوتوں میں کبریائی
خودی کی جلوتوں میں مصطفائی

معراج مصطفوی کا یہ پہلو اسلام کے اس تمدنی رخ کا بہترین اظہار ہے کہ کسی فرد کے روحانی تجربہ کی جانچ کا معیار کیا ہے۔ کسی ولی، کسی بزرگ کے روحانی مقام کا یہ معیار قائم ہوتا ہے کہ عام دنیائے انسانیت پر اس کے کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ آیا وہ سکون پسند بنتا ہے یا اپنی شخصیت کے استحکام کے ذریعہ دنیا کے لئے نفع رسانی کا ذریعہ بنتا ہے۔ خلوت کے ان لمحات میں جہاں وہ خدائے بزرگ و برتر سے نزدیک ہوتا ہے جہاں وہ معرفت کی نئی منزلوں سے ہم کنار ہوتا ہے وہ اس سماج میں، جہد و عمل کی دنیا میں بھرپور حصہ لیتا ہے۔

خلوت و جلوت ایک ہی سالک کے دو مقامات ہیں جن کی تکمیل ایک دوسرے پر منحصر ہے صرف کسی ایک پہلو پر قیام کرنا زندگی کے تقاضوں کا نامکمل اظہار ہے۔

چیست جلوت، درد و سوز آرزو است
انجمن دیداست، و خلوت جستجو است
گرچہ اندر خلوت و جلوت خدا است
خلوت آغاز است و جلوت انتہا است

حضرت عبدالقادر جیلانیؒ فرماتے ہیں کہ ایک سالک خانقاہی نظام میں تزکیہ و تربیت کے بعد مخلوق کی جانب مامور من اللہ ہو جاتا ہے، تزکیہ کے ساتھ ساتھ اللہ کی جانب سے ماموریت کا یہ پہلو آج کی ہماری زندگی میں اوجھل ہو گیا ہے۔

معراج کے واقعہ کے بعد ہی مدنی دور کے آغاز سے قبل اسلامی معاشرہ کی تشکیل کے بنیادی اصول بتادئے جاتے ہیں۔ شرک سے بچنے کی تاکید کے بعد تمام احکامات' خاندانی زندگی، اخلاقی فضاء کی تخلیق، محروموں، غریبوں اور مسکینوں کے مفادات کا تحفظ، دولت کا مناسب استعمال غرض اجتماعی زندگی سے متعلق احکام پر مشتمل ہیں جن پر ایک نئے معاشرہ کو قائم اور استوار کرنے کا مرحلہ درپیش تھا۔

معراج مصطفویؐ کا یہ عظیم واقعہ اس بات کا درس دیتا ہے کہ خدا جوئی، خدا شناسی کا سفر، سکون کا لمحہ نہیں ہے بلکہ ایک نئی طاقت اور توانائی کا حصول ہے تا کہ اس قوت اور توانائی کو استعمال کرتے ہوئے الٰہی قدروں کو زمانہ کی زندہ حقیقت بنا دیا جائے۔

حضور اکرم ﷺ کو دس سالہ مدنی زندگی میں ۲۷ غزوات میں حصہ لینا پڑا اسکے علاوہ سرایا کی تعداد مورخین نے ۳۵ تا ۶۳ بتائی ہے۔ اگر ہم کم از کم تعداد ۳۵ مقرر کر لیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ کو دس سال کے دور میں کوئی ۶۲ جنگی مہمات سر کرنی پڑیں جس کا اوسط کوئی ہر دو ماہ میں ایک جنگی مہم کا ہوتا ہے۔ اسی ایک بات سے ہم بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں کہ آپ کی عملی جدوجہد اور کش مکش کا کیا عالم ہوگا؟

زندگی مراقبہ اور مجاہدہ دونوں پہلوؤں پر منحصر ہے۔ یہ معراج مصطفویؐ کا ایک اور اہم تمدنی پہلو ہے۔ زندگی محض تنہائی کوہ ودمن کا نام نہیں بلکہ سوز و سرور انجمن بھی ہے بدقسمتی سے ہم میں سے بہت سے لوگوں کے نزدیک کسی شخص کے اللہ والا ہونے کا معیار یہ ہے کہ وہ دنیا کے ہنگاموں سے دور ہو جائے۔ کش مکش اور جدوجہد سے گریز کرے۔ اپنے ماحول سے بے نیاز ہو جائے۔ لیکن فقر کا صحیح تصور یہ ہے کہ عالم تمام مومن جانباز کی میراث ہے مومن کا فقر حالات کے جبر کا نام نہیں ہوتا بلکہ اختیاری اور خالصتاً لوجہ اللہ ہوتا ہے۔ اس توازن کی مثال حضرت علیؓ کی زندگی ہے۔ اقبال حضرت علی مرتضیٰؓ کے اسمائے گرامی کی تشریح کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ایک طرف تو وہ بوتراب ہیں تو دوسری طرف حیدر کرار، بوترابی نام ہے فقر کا، بے نیازی کا، اقلیم تن کو فتح کرنے کا اور اس کے ساتھ کرّاری ضرب ہائے ''پے بہ پے'' کا نام ہے، قوت کے اظہار کا نام ہے۔ شوکت اور عظمت کا اعلان ہے۔ پھر حضرت علیؓ کا ایک لقب ید اللہ ہے۔ ید اللہی عشق الٰہی کی اس اعلیٰ کیفیت کا نام ہے جہاں بندہ کی مرضی، مولا کی مرضی سے ہم آہنگ ہو جاتی ہے اور وہ اس عالم رنگ و بو کی تسخیر کرنے والا بن جاتا ہے آپ باب العلم بھی ہیں جس میں کائنات کے ہر پہلو کا علم شامل ہے جو انسانیت کو اس دنیا میں سربلند اور غالب بناتا ہے۔

''کبھی تنہائی کوہ ودمن عشق رکبھی سوز و سرور وانجمن عشق رکبھی سرمایۂ محراب و منبر رکبھی مولا علی خیبر شکن عشق''۔

اسی معراج میں ساری امت مسلمہ کو حاصل ہونے والا بیش بہا تحفہ اور ایک عظیم نعمت نماز ہے، جو بجائے خود دعا ہے۔ دعا کیا ہے؟ دعا کو مغز العبادۃ۔ یعنی عبادت کا مغز، اس کی روح، یعنی اس کا Essence کہا گیا۔ اقبال کے الفاظ میں ''دعا'' خواہ انفرادی ہو یا اجتماعی ضمیر انسانی کی اس نہایت آرزو کی ترجمان ہے کہ کائنات کے اس ہولناک سناٹے میں اپنی پکار کا جواب سنے۔ اور خدائے بزرگ و برتر کا ارشاد ہے۔ ''مجھے پکارو میں تمہاری پکار کا جواب دیتا ہوں۔'' یاد رہے دعا کو سلاح المومنین، مومن کا اسلحہ بھی کہا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دعا ایک عزم کا اظہار ہے۔ بہترین دعا جو ہمیں سکھائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ۔ ربنا اتنا فی الدنیا حسنۃ و فی الآخرۃ حسنۃ۔ دنیا کا سدھار اور اس کے لئے پوری جدوجہد کے لئے نماز کی خلوت، دعاؤں میں التجا فریاد اسی جدوجہد عمل کے لئے تربیت کا نام ہے۔ مومن جب اس رمز کو سمجھ لیتا ہے تو اس کی اذان ندائے آفاق بن جاتی ہے اور اس کی تکبیر سے شبستانِ وجود لرزنے لگتا ہے۔

وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستانِ وجود
ہوتی ہے بندۂ مومن کی اذاں سے پیدا

اگر اس کا یہ تمدنی پہلو نظر انداز ہو جائے تو ہمارے سارے مراقبے، ہماری ساری عبادات اپنے مقصد کی تکمیل سے محروم رہتی ہیں۔

یہ ذکرِ نیم شبی، یہ مراقبے یہ سرور
حرم کے درد کا درماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

بات ایک ہی ہے لیکن ہمارے ذہنی رویہ کا تعین بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔

یا وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل
یا خاک کی آغوش میں تسبیح و مناجات
وہ مذہب مردانِ خود آگاہ و خدامست
یہ مذہب ملا و جمادات و نباتات
الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن
ملا کی اذاں اور مجاہد کی اذاں اور

معراجِ مصطفویؐ کے جن پہلوؤں کی جانب میں نے اشارہ کیا ہے اس سے بخوبی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ معراج جو مکی دور کے اختتام اور مدنی دور کے آغاز کے درمیان واقع ہوئی ایک عظیم معنویت اور تمدنی قدر اپنے اندر رکھتی ہے۔ مکی دور میں شانِ عبودیت کا مکمل اظہار ہے اور مدنی دور میں شانِ رسالت کا کامل ظہور ہے۔ واضح رہے کہ زندگی کے یہ دو رخ علیحدہ نہیں بلکہ ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں روحانی ارتقاء کی معراج ایک ایسے ہمہ جہتی انقلاب کا نقطۂ آغاز ہے جہاں ہر طرف کمال ہے، حسن ہے، دنیائے رنگ و بو اور اس کی ساری جلوہ آرائیوں کی معراج تخلیق آدم ہے، آدمیت کی معراج انبیائے کرام کا ظہور ہے، انبیائے کرام کی معراج حضور رسالت مآبؐ کا وجود مقدس ہے اور حضور اکرمؐ کی معراج ساری انسانیت کی معراج ہے۔ وہؐ اسماء وصفات کا مظہر اتم ہیں تکوین اور تخلیق کا آخری اور مکمل نمونہ ہیں اور اس معراج کا اہم پہلو یہ ہے کہ اس کے صدقہ میں ساری انسانیت کے لئے آپ کے نام لیواؤں کے لئے اس کے فیوض اور برکات کے دروازے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کھول دیئے گئے۔

دنیا میں جہاں کہیں کوئی خوبی ہے، جہاں کہیں حسن و کمال ہے تو گویا وہ نور مصطفیٰ ﷺ سے مستنیر ہے یا کہیں خوب سے خوب تر کی جستجو، تکمیل کیطرف پرواز ہے، کمال کی آرزو ہے تو سمجھ لو کہ اسے نور مصطفیٰ ﷺ کی تلاش ہے۔

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو
آنکہ از خاکش بروید آرزو
یا ز نورِ مصطفیٰؐ اُو را بہاست
یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰؐ است

ماخوذ: سوینئر ۱۹۸۰ء

☆☆☆

ہجرت آئینِ حیاتِ مسلم است

(پندرھویں صدی ہجری کے آغاز کے موقع پر کی گئی تقریر)

ہجرت نبویؐ تاریخ انسانی میں ایک نئے دور کا نقطۂ آغاز ہے۔ اس واقعہ کی اہمیت کا اندازہ صرف اسی ایک بات سے کیا جا سکتا ہے کہ حضرت عمرؓ جیسی دیدہ ور اور نکتہ رس شخصیت نے اس انقلاب آفریں واقعہ ہی سے اسلامی تقویم کا آغاز کیا۔ آج جب کہ پندرھویں صدی ہجری تقاریب اور جشن کا دنیا میں چرچا ہے۔ عالم اسلام ایک نئے کرب اور اضطراب سے گزر رہا ہے۔ اس موقع پر ہجرت نبویؐ کے اسرار وحکمت کا مطالعہ ہمیں فکر ونظر کی نئی جہتوں سے سمجھنے کا موقع عطا کرتا ہے۔

اصل موضوع پر کچھ عرض کرنے سے پہلے مناسب ہوگا کہ نہایت اختصار کے ساتھ ہجرت کے پس منظر کو واضح کیا جائے تاکہ ہجرت کی معنویت اور اس کے دور رس اثرات کو سمجھنے میں مدد مل سکے۔ غارِ حرا سے غارِ ثور تک یہ سفر مختلف مقامات اور کیفیات کا مظہر ہے۔ غارِ حرا کی خلوت بھی ایک طرح کی ہجرت ہے اقبال کے الفاظ میں یہ ہجرت سوئے حق ہے' معرفت کی جستجو ہے۔ لیکن معرفتِ حق کے بعد حرا میں حکم اقراء ہی سے حق کے ابلاغ کا راستہ کھل جاتا ہے اور یہ دعوت اپنے قرابت داروں میں، فاران کی چوٹی پر، مکہ کی گلیوں میں، عکاظ کے میلوں میں، بازاروں میں بیت اللہ کے نواح میں گونجنے لگتی ہے۔ مکی دور کے دس سالہ دور پر ایک طائرانہ نظر ڈالئے، دیکھئے چشم تصور کن مناظر سے گزرتی ہے۔ دعوتِ حق کا تمسخر ہو رہا ہے، امین اور صادق کو ذہنی اور جسمانی تکلیف پہنچائی جا رہی ہے، جانثاروں پر ظلم وستم کا وہ کونسا حربہ ہے جو آزمایا نہیں جا رہا ہے، غرض غار حرا سے شعب ابی طالب، شعب ابی طالب سے طائف اور اس درمیان میں عام الحزن جیسی سخت ترین منزل بھی آتی ہے اسی کش مکش اور جدوجہد کے دوران ایسے چند جیالے اس دعوت حق کو قبول کر لیتے ہیں جو ظلم وستم کی بھٹی میں تپ کر کندن بن کر نکلتے ہیں، خدائے واحد پر غیر متزلزل ایمان نے ان کی زندگی کو منقلب کر دیا، رسول اللہ ﷺ پر ایمان اور اس ذات گرامیؐ سے وابستگی نے سرفروشی اور جانثاری کی وہ کیفیت پیدا کر دی کہ صداقت اور سچائی کی راہ میں ہر قسم کی قربانی کو ہنستے کھیلتے پیش کریں۔ مکی دور میں مصائب اور تعذیب

جب اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ جاتے ہیں تو روحانی ارتقاء کا وہ اعلیٰ مقام آتا ہے۔ جس کو ہم معراج کے نام سے یاد کرتے ہیں معراج جہاں آیات کبریٰ کے مشاہدہ، حقائق اعلیٰ کی یافت اور قرب الٰہی کے کمال کی منزل ہے وہیں غلبہ کی بشارت اور نصرت کی نوید ہے۔ جس کا ربط ساری تقدیر انسانی سے ہے، اقبال کہتے ہیں کہ روحانی بلندی کے اعلیٰ ترین مقام تک پہنچنے کے بعد ایک نبی کی واپسی، تخلیقی ہوتی ہے۔ پانچویں خطبہ میں اقبال کہتے ہیں ''وہ اس واردات سے واپس آتا ہے تو اس لئے کہ زمانہ کی رو میں داخل ہو جائے اور پھر ان قوتوں کے غلبہ اور تصرف سے جو تاریخ عالم کی صورت گر ہیں مقاصد کی ایک نئی دنیا آباد کرے''۔ اس طرح معراج اور ہجرت میں ایک گہرا اور معنوی ربط ہے، سورۂ بنی اسرائیل میں جس کا آغاز ہی واقعہ اسریٰ سے ہوتا ہے، ہجرت کا اشارہ مل جاتا ہے، ایک ناسازگار ماحول سے نکل کر ایک نئی فضاء میں داخل ہونے اور غلبہ و نصرت کی بشارت ہے۔

ہجرت کا پورا Process معراج کے بعد ہی سے شروع ہو جاتا ہے۔ معراج کے بعد بعثت مبارک کے گیارہویں سال، مدینہ کے ایک قبیلہ خزرج کے ۶ افراد اسلام قبول کرتے ہیں، دوسرے سال یہ تعداد دگنی ہو جاتی ہے اور تیسرے سال بیعتِ عقبۂ ثانیہ کے موقع پر ۷۲ اصحاب رسول اکرمؐ کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں اور آپؐ کو مدینہ آنے کی دعوت دیتے ہیں۔ یہ بیعت عام طرح کی بیعت نہیں تھی بلکہ ۷۲ افراد کے اس گروہ میں شامل ہر فرد اس فیصلہ کے نتائج اور عواقب سے بخوبی واقف تھا حضرت عباسؓ نے انتباہ دیا کہ اے یثرب کے لوگو! یہ عرب و عجم کے خلاف اعلان جنگ ہے، سخت خونریز لڑائی کو دعوت دینا ہے، اس وفد کے ایک رکن اسعد بن زرارہؓ کھڑے ہو کر اس بیعت کے نتائج سے اپنے ساتھیوں کو یوں واقف کرواتے ہیں۔ ٹھہرو! اے اہلِ یثرب ہم لوگ انکے پاس آئے ہیں تو اس لئے کہ یہ اللہ کے رسول ہیں اور آج انہیں یہاں سے نکال لے جانا تمام عرب سے دشمنی مول لینا ہے، اس کے نتیجہ میں تمہارے نونہال قتل ہوں گے، تلواریں تم پر برسیں گی، لہٰذا تم اس کو برداشت کرنے کی طاقت اپنے اندر پاتے ہو تو ان کا ہاتھ پکڑو اور اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہے۔ لیکن اگر تمہیں اپنی جانیں عزیز ہیں۔ تو پھر چھوڑ دو۔ کیوں کہ اس وقت عذر کر دینا خدا کے نزدیک قابلِ قبول ہو سکتا ہے۔ اس بات کو بانداز دیگر ایک دوسرے رکن عباس بن عبادہؓ یوں دہراتے ہیں کیا تم جانتے ہو کہ اس شخص سے کس بارے میں بیعت کر رہے ہو تم ان کے ہاتھ پر بیعت کر کے دنیا بھر سے لڑائی مول لے رہے ہو،

پس اگر تمہارا یہ خیال ہو کہ جب تمہارے اموال اور تمہارے اشراف ہلاکت کے خطرہ میں پڑ جائیں تو تم انہیں دشمنوں کے حوالے کر دو گے تو بہتر ہے آج ہی انہیں چھوڑ دو، کیوں کہ خدا کی قسم! یہ دنیا اور آخرت کی رسوائی ہے اور اگر تمہارا ارادہ ہے کہ جو بلاوا تم اس شخص کو دے رہے ہو اس کو اپنے اموال اور اشراف کی ہلاکت کے باوجود نبھاؤ گے تو بے شک اس کا ہاتھ تھام لو کہ خدا کی قسم اس میں دنیا و آخرت کی بھلائی ہے۔

جب وفد کے سارے ارکان اس بات کا اعلان کرتے ہیں کہ وہ اپنے اموال کی تباہی اور اپنے اشراف کی ہلاکت کا خطرہ مول لینے تیار ہیں تو تب کہیں بیعت کی تکمیل ہوتی ہے اور تاریخ گواہ ہے کہ انصار نے ہر نازک موقع پر اس عہد کو پورا کیا۔

میں نے بیعت عقبہ ثانیہ کے موقع پر اس گفتگو کو اس لئے پیش کیا ہے کہ یہ بات واضح ہو جائے کہ جو دعوت مکہ والوں نے رد کر دی اسے کس طرح مدینہ والے قبول کر رہے ہیں اور " **واجعلنی من لدنک سلطانا نصیرا** "۔ کی دعا کے جواب میں قبولیت اور تسخیر کے کیا سامان ہو رہے ہیں۔

اس کے بعد ہجرت سے متعلق ساری تفصیلات تاریخ میں محفوظ ہیں۔ مدینہ پہنچ کر مہاجرین کی باز آبادکاری، مواخاۃ، مدینہ کے نواح میں آباد یہودیوں کی بستیوں اور دیگر قبائل سے معاہدے، ان سارے مرحلوں سے گزر کر دنیا کی پہلی اسلامی مملکت کی تشکیل عمل میں آتی ہے۔ ان واقعات میں سے ہر واقعہ اپنے اعتبار سے منفرد اور بے نظیر ہے۔ تفصیلات کا یہ موقع نہیں ہے بلکہ یہاں میں ہجرت کی حکمت اور اس کے چند انقلابی پہلوؤں کی جانب چند اجمالی اشارے کرنا چاہتا ہوں

☆ یہ بات واضح رہے کہ ہجرت محض نقل مقام کا نام نہیں ہے، دشمنوں کے نرغہ سے نکل کر کسی محفوظ پناہ گاہ کی تلاش نہیں ہے۔ مصائب سے بچ کر کسی گوشۂ عافیت کی آرزو نہیں ہے۔ بلکہ تنگنائیوں سے نکل کر ایک عالمگیر اور ہمہ گیر انقلاب کے لئے ایک مرکز کی تشکیل کا نام ہے منتشر قوتوں کی تنظیم کا نام ہے۔

اقبال کہتے ہیں:

پس چرا از مسکنِ آباء گریخت
تو گماں داری کہ از اعداء گریخت

قصہ گویاں حق زما پوشیدہ اند
معنیٔ ہجرت غلط فہمیدہ اند
ہجرت آئینِ حیاتِ مسلم است
ایں ز اسبابِ ثباتِ مسلم است
معنی اُو از تنک آبی رم است
ترکِ شبنم بہرِ تسخیریم است
بایدت آہنگِ تسخیر ہمہ
تا تو می باشی فراگیر ہمہ

مسکن آباء سے مراد وطن ہے اور انسانی نفسیات کے اعتبار سے آدمی وطن کی محبت سے سرشار ہوتا ہے لیکن آئین حیات کے مقابلہ میں اس کی اہمیت ثانوی ہوتی ہے۔ یہ عارضی زندگی کا ایک مرحلہ ضرور ہے لیکن ابدیت کے وسیع تناظر میں ہجرت زمین پیوستگی (Earth Rootedness) کے سارے محدود رجحانات کو ختم کر دیتی ہے اور اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ اسلام کو زمین کے خانوں میں مقید نہیں رکھا جاسکتا ہے۔ یہ امت مکان کی پابند space bound نہیں ہے۔ ہجرت کی بنیاد پر پندرھویں صدی تقاریب منانے والے عالمِ اسلام کے بیشتر ملکوں کے لئے ہجرت کا یہ پہلو لمحۂ فکر فراہم کرتا ہے کہ مسکن آباء کا یہ تصور، وسیع تر امت کی تشکیل میں کس کس انداز سے حارج ہو رہا ہے۔ اِس میں کوئی شک نہیں ہے کہ نسل، قوم اور وطن شناخت کا ذریعہ ہیں لیکن ہجرت کے ذریعہ اس اساسی انقلاب کی بنیاد رکھ دی گئی جو خالص روحانی اور انسانی بنیاد پر تشکیل پاتا ہے۔

☆ ہجرت ہمیں یہ بھی بتاتی ہے کہ اسلام سارے خونی رشتوں سے بھی بالاتر ہونے کا نام ہے۔ اس کی تشکیل صرف کلمہ طیبہ کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ ہجرت ہی کی بات ہے کہ حضرت ام سلمہؓ اپنے شوہر اور شیر خوار بچے سے بچھڑ کر رہ گئیں اور تقریباً ایک سال تک ان کی دلگداز آہیں اس مقام پر بلند ہوتی رہیں جہاں وہ اپنے بچے اور شوہر سے جدا کر دی گئی تھیں۔ عرب کے اس معاشرہ میں جہاں قبیلہ کے کسی فرد کے قتل پر نسل در نسل بدلہ کا سلسلہ جاری رہتا کیسی انقلابی تبدیلی آ گئی، اس کا اندازہ صرف ایک ہی واقعہ سے کیا جاسکتا ہے کہ جو ہجرت کے چند ماہ بعد ہی غزوۂ بدر کے مقام پر پیش آیا۔

غزوۂ بدر کا موقع ایسا ہے کہ اپنے ہی خونی رشتہ داروں، خاندان والوں اور قبیلہ والوں سے لڑائی ہے۔ فرق کفر اور ایمان کا ہے۔ اس لڑائی کی یاد تازہ کرتے ہوئے ایک دفعہ حضرت صدیقؓ کے صاحبزادہ نے جو اس وقت تک مشرف بہ اسلام نہیں ہوئے تھے اپنے والد محترم سے فرمایا کہ ایک موقع پر آپ میری تلوار کی زد پر تھے لیکن باپ کی محبت غالب آگئی اور میں نے آپ کو چھوڑ دیا۔ حضرت صدیقؓ جواب دیتے ہیں کہ بیٹے! یہ تمہارے کفر کی کمزوری تھی اگر تم میری زد پر ہوتے تو میں تمہیں کبھی نہ بخشتا۔

ہجرت نام ہے جانی دشمنوں تک بھی امانت پہنچا دینے کا۔ قتل کا منصوبہ بنائے ہوئے، مشرکین بیت اطہر کا محاصرہ کیے ہوئے ہیں، لیکن ننگی تلواروں کی چھاؤں میں آپ حضرت علیؓ کو اپنے بستر مبارک پر لٹا دیتے ہیں کہ حق داروں تک ان کی امانت پہنچا دیں۔ دین اسلام بھی مہاجر نبیؐ کے نام لیواؤں کے پاس ایک امانت ہے جسے حق داروں تک پہنچا دینا انکا فرض منصبی ہے۔

☆ ہجرت نام ہے اللہ اور اس کی نصرت پر مستحکم یقین کا۔ حق کے لئے جدوجہد کے راستہ میں جب کبھی تم دیکھو کہ دشمن تمہارے سروں پر آپہنچا ہے۔ تم دشمنوں کے نرغے میں پھنس چکے ہو تو یاد رہے کہ آج بھی غارِ ثور سے بلند ہونے والی یہ صدا فضا میں گونج رہی ہے کہ "لا تحزن ان اللہ معنا"

☆ ہجرت نام ہے اپنے اموال، اپنی جائدادوں اور اپنی مرغوب متاع کو راہِ خدا میں ترک کرنے اور دین کی نصرت میں اپنے مال کو قربان کرنے کا۔

اور اس سے بڑھ کر کبھی اپنی جان کو آفریں کے سپرد کر دینا بھی ہجرت سوئے دوست ہے

جنگ مومن چیستِ ہجرت سوئے دوست
ترکِ عالم اختیارِ کوئے دوست

☆ ہجرت نام ہے اللہ کی راہ میں جدوجہد کے لئے منتشر قوتوں کی شیرازہ بندی کا۔ ایک مستحکم مرکز سے قریب رہنے اور اسے تقویت دینے کا۔ ہجرت کے بعد دائرہ اسلام میں داخل ہونے والوں کو اس بات کی تاکید تھی کہ وہ اپنے مستقر کو چھوڑتے ہوئے مدینہ میں آبسیں۔ اس حکم پر پابندی فتح مکہ تک جاری رہی۔

☆ ہجرت ہی میں اس فراست اور حکمت کا درس پوشیدہ ہے کہ جب قوی دشمن سے مقابلہ ہو

تو حق کی قوتوں کو تقویت دینے کے لئے کیا حکمتِ عملی اختیار کی جائے۔ کس طرح غیر جانبدار قوتوں کو دشمنوں کا حلیف بننے سے روکا جائے اور ان کی اخلاقی تائید کیسے حاصل کی جائے۔ یہودیوں اور دیگر قبائل سے کیا گیا معاہدہ فراستِ نبوی کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔

آج بھی جب کہ مختلف خطوں میں بٹے ہوئے مسلمان مختلف متصادم قوتوں سے نبرد آزما ہیں، انہیں یہ مرحلہ درپیش ہے کہ موجودہ صورتِ حال سے کس طرح نمٹیں، ہماری توجہ صرف مخالفین پر اتنی مرکوز ہو جاتی ہے کہ ہم ایسی قوتوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں جو عبوری مدت ہی کے لئے سہی ہماری طرف دار بن سکتی ہیں یا جن کی اخلاقی تائید ہم حاصل کر سکتے ہیں۔ کبھی کبھی ایسے موقع پر جب کہ کسی خیر کے انتخاب کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، کسی کم تر برائی کا انتخاب بھی ہماری فراست کا امتحان بن جاتا ہے۔ اس حکمتِ عملی کا یہ پہلو بھی ہے کہ جب اسلامی قوتیں موثر اور متصرف ہو جاتی ہیں تو اندرونی استحکام کے ساتھ ساتھ اپنے وسائل کو بھرپور انداز میں استعمال کرنے میں دیر کرنی نہیں چاہیے۔ بلکہ وقت پڑنے پر اپنے اثر وقوت کو محسوس بھی کروانا چاہئے تا کہ مخالف کو اس کی اہمیت کا اندازہ ہو سکے۔ مدینہ میں ایک نئے سیاسی نظم کی تشکیل کے بعد یمن سے شام کی تجارتی شاہراہ مسلمانوں کی زد پر آ گئی۔ قریش کی تجارت کا دارومدار اسی شاہراہ پر تھا۔ اس موقف کو مشرکین مکہ پر ظاہر کر دیا گیا۔ چنانچہ جنگ بدر سے قبل سعد بن معاذؓ جب عمرہ کے لئے مکہ تشریف لے گئے تو حرم کے دروازہ پر ابوجہل نے روک دیا اور کہا کہ تم ہمارے باغیوں کو پناہ دیتے ہو، ان سے تعاون اور نصرت کا دم بھرتے ہو اور اس کے باوجود تم یہ چاہتے ہو کہ ہم تمہیں چین سے مکہ میں طواف کرنے دیں۔ سعدؓ نے جواب میں کہا اگر تم نے مجھے اس سے روک دیا تو میں تمہیں اس چیز سے روک دوں گا جو تمہارے لئے اس سے شدید تر ہے (یعنی مدینہ سے تمہاری رہ گزر)۔ جہاں جہاں مسلمان اس موقف میں ہیں کہ وہ اپنے اثر اور موقف کو امتِ مسلمہ کی تائید میں محسوس کروا سکیں ان کے لئے ہجرت کی یہ حکمتِ عملی ایک لحۂ فکر فراہم کرتی ہے لیکن صورتِ حال یہ ہے کہ بیشتر ممالک نہ تو اپنے حقیقی داخلی استحکام پر متوجہ ہیں اور نہ اپنے وسائل کی قوت کو حق کی نصرت کے لئے استعمال کرنا چاہتے ہیں بلکہ ان نام نہاد مسلم ممالک میں زور اس بات پر ہے کہ اگر اسلام کے نام پر اقتدار مل جائے تو کسی طرح ذاتی اقتدار کے استحکام کی کوشش کریں۔

میں نے نہایت اختصار کے ساتھ ہجرت سے متعلق چند اہم پہلوؤں کو پیش کرنے کی کوشش کی

ہے اور آخر میں ایک بات کی طرف توجہ کا طالب ہوں کہ سیرتِ طیبہ محض تاریخ کا گزرا ہوا لمحہ نہیں ہے بلکہ ابدی سرچشمہ ہدایت کے اعتبار سے اس حیاتِ طیبہ کا ہر نقش ہماری اجتماعی جدوجہد کے سفر میں روشنی کا مینار ہے۔ جس طرح ہجرت، مصائب کے ہجوم میں ایک عالمگیر اور ہمہ گیر انقلاب کا نقطۂ آغاز بنی، اسی طرح عالم اسلام کی موجودہ اضطرابی کروٹیں بیداری کی بشارت بن سکتی ہیں لیکن شرط یہی ہے کہ ہم اپنے ذہن کی تنگنائیوں سے نکل کر وسیع تر فضاؤں میں آئیں۔ دین کی محدود تاویلات میں الجھتے رہنے کی بجائے اعلیٰ تر نصب العین کا ادراک کریں اور ان قوتوں کو مجتمع کرنے کا ذریعہ بنیں جو ساری انسانیت کی تعمیر نو کے لئے ضروری ہیں۔ غارِ حرا سے غارِ ثور تک سفر طے کرنے کے بعد ہی ایک نئی صبح کی نوید ہے۔ (سونیر ۱۹۸۱ء)



عقیدہ ختم نبوت کی تہذیبی قدر فکر اقبال کی روشنی میں

(اقبال اکیڈمی پربھنی، مہاراشٹرا کے زیر اہتمام منعقدہ سمینار ۱۹۷۹ء میں پڑھا گیا)

اسلام میں ہدایت کی اولین شرط ایمان بالغیب ہے۔ لیکن یہ کوئی ایسی ما فوق العقل (Supernatural) بات نہیں جو ذہن انسانی پر مسلط کردی گئی ہو بلکہ یہ حیات و کائنات کی وہ ارفع سطحات میں جن تک ہماری محدود عقل کی رسائی نہیں ہے۔ مشاہدہ اور علم کی اعلیٰ سطح پر چند حقائق کی یافت ممکن ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ غیب، غیب ہی رہے گا کہ اس کے بغیر زندگی بامعنی نہیں ہوسکتی۔ چونکہ ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی کے سارے اعمال ایمان کی بنیاد پر متعین ہوتے ہیں اس لئے عقائد کی تعبیر اور توجیہہ اور تاریخ انسانی میں اس کے مضمرات اور اثرات حکمائے اسلام کا خاص موضوع رہے ہیں۔ اقبال کا یہ کارنامہ ہے۔ انہوں نے ایمان اور عقل کے ربط کی توضیح کی اور ان کے درمیان توازن قائم کرنے کی کوشش کی۔ ایک ایسا توازن جو دشوار بھی ہے اور نازک بھی۔ اقبال کے نزدیک ایمان محض جذبہ و تاثر کا نام نہیں بلکہ اس میں بھی ایک انداز علم و عقل موجود ہے۔ یہی منہاج فکر ہمیں اقبال کے خطبات میں کارفرما نظر آتا ہے۔

عقیدۂ ختم نبوت اسلام میں بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ نبوت کی خاتمیت کا تصور زندگی کو محصور و محدود اور حرکت سے عاری نہیں کرتا بلکہ اسی تصور میں دینِ اسلام کی تازگی اور اس کے زمانی تسلسل کا راز پوشیدہ ہے۔ تاریخ کی روشنی میں بلاخوف تردید یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ ایک آخری نبی کی صفات و خصوصیات کی جانچ کے لئے جو بھی عقلی معیارات قائم کئے جاسکتے ہیں۔ ان پر ذات رسالت مآب ﷺ کی سیرت طیبہ پوری پوری اترتی ہے۔ اس مکمل سیرت کے حفظ و نشر کا جو اہتمام کیا گیا۔ اس کی نظیر نہیں ملتی۔ اس کے علاوہ خلافت انسانی کا تصور ایک ایسی ہستی کے وجود پر دلالت کرتا ہے جو تکوین و تخلیق کا آخری نتیجہ اور تمام اسماء و صفات کا مظہر اتم ہو لیکن عقیدہ ختم

نبوت کے بارے میں اقبال کے افکار کا محور محض دینیاتی نہیں ہے بلکہ انہوں نے انسانیت کی تاریخ میں اس عقیدہ کے معاشرتی اور تمدنی پہلوؤں کا جائزہ لیا ہے۔ اس بارے میں خطبات میں بعض مضامین اور خطوط میں پیش کردہ خیالات ان کی ندرت فکر کے آئینہ دار ہیں۔ مثنوی رموز بے خودی میں بھی انہوں نے اسلام کی ہیئت اجتماعیہ کے اساسی تصورات کو پیش کرتے ہوئے منصب نبوت اور خصوصاً اسلامی تمدن میں ختم نبوت کے مضمرات کو واضح کیا ہے۔ اس سلسلہ میں اقبال کے خیالات کو پیش کرنے سے قبل شاید یہ مناسب ہوگا کہ خود اسلام کے اصولی موقف اور منصب نبوت کے بارے میں اقبال کی چند بنیادی توضیحات پیش کردی جائیں جس کی روشنی میں نفس مضمون کو متعین کرنے اور سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے۔ اقبال کے نزدیک اسلام کے دو بنیادی پہلو ہیں ایک وحدت فی الحیات اور دوسرے حرکت فی الحیات۔

اقبال کہتے ہیں کہ ''تہذیب وثقافت کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو بہ حیثیت ایک تحریک اسلام نے دنیا سے قدیم کا یہ نظریہ تسلیم نہیں کیا کہ کائنات ایک ساکن وجامد وجود ہے۔ برعکس اس کے وہ اسے متحرک قرار دیتا ہے۔ جہاں تک بطور ایک نظام اجتماعی جذبات سے کام لینے کا تعلق ہے۔ اس نے رنگ وخون کے رشتے رد کردیئے۔ رنگ وخون کا رشتہ زمین پیوستگی کا رشتہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اتحاد انسانی کے لئے کسی خاص نفسیاتی اساس کی جستجو تب ہی کامیاب ہوسکتی ہے جب اس حقیقت کا ادراک ہو جائے کہ نوع انسانی ایک ہے اور اس کا مبدء اصلا روحانی ہے[1] اب وحدت کی اس اساس پر اسلام محض انسان کی اخلاقی اصلاح کا ہی داعی نہیں بلکہ اس کا مقصود عالم بشریت کی اجتماعی زندگی میں ایک تدریجی مگر اساسی انقلاب ہے جو اس کے قومی اور نسلی نقطۂ نظر کو یکسر بدل کر اس میں خالص ضمیر انسانی کی تخلیق کرے''۔ [۲]

یہاں تاریخ ادیان کی روشنی میں اقبال اسلام اور دیگر مذاہب کے فرق کو ظاہر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ قدیم زمانہ میں دین قومی تھا جیسے مصریوں، یونانیوں اور اہل ہند کا، بعد میں نسلی قرار پایا۔ جیسے یہودیوں کا مسیحیت نے یہ تعلیم دی کہ دین انفرادی اور شخصی ہے جس سے یورپ میں یہ بحث پیدا ہوئی کہ دین چونکہ پرائیوٹ عقائد کا نام ہے اس لیے انسانوں کی اجتماعی زندگی کی ضامن صرف اسٹیٹ ہے۔ یہ اسلام ہی تھا جس نے بنی نوع انسان کو سب سے پہلے یہ پیغام دیا

کہ دین نہ صرف قومی ہے نہ نسلی نہ انفرادی اور نہ پرائیوٹ بلکہ وہ خالصتاً انسانی ہے اور اس کا مقصد باوجود تمام فطری امتیازات کے عالم بشریت کو متحد اور منظم کرنا ہے۔ ایسا دستورالعمل قوم اور نسل پر مبنی نہیں ہوسکتا۔ نہ اسے پرائیوٹ کہہ سکتے ہیں بلکہ اس کو صرف معتقدات پر ہی نہیں کہا جاسکتا ۔صرف یہی ایک ایسا طریقہ ہے جس سے عام انسان کی جذباتی زندگی اور اس کے افکار میں یک جہتی پیدا کی جاسکتی ہے۔

اقبال کی نظر میں کائنات کی روحانی تعبیر اور فرد کی روحانی آزادی کی بنیاد پر ایک ایسی اخلاقی فضا کی تخلیق اور ایک ایسے معاشرے کی تشکیل جس میں پرورش پا کر فرد اپنے کمالات کو پہنچتا ہے۔ منصب نبوت کا اہم نتیجہ ہے۔ اقبال نے اس بات کی یوں توضیح کی ہے کہ نبوت کے دو اجزاء ہیں۔ ایک خاص حالات وواردات جس کے اعتبار سے نبوت روحانیت کا ایک مقام تصور کی جاتی ہے دوسرے ایک Socio-Political institution قائم کرنے کا عمل یا اس کا قیام [۳] اس اعتبار سے اقبال نبوت کی تعریف یوں کرتے ہیں کہ یہ شعور وہ شکل ہے جس میں واردات اتحاد اپنے حدود سے تجاوز کرتیں اور ان قوتوں کی پھر سے رہنمائی یا از سر نو کی وسائل ڈھونڈھتی ہیں جو حیات اجتماعیہ کی صورت گر ہیں۔ گویا انبیاء کی ذات میں ۔ زندگی کا متناہی مرکز اپنے لامتناہی اعماق میں ڈوب جاتا ہے تاکہ پھر ایک زندہ قوت اور توانائی سے ابھر سکے۔[۴]

حضور اکرمؐ کے لائے ہوئے ہمہ جہتی عالمگیر انقلاب کی اقبال نے واقعہ معراج کی روشنی میں ایک انقلابی تعبیر کی ہے۔ پانچویں خطبہ کے آغاز میں مشہور صوفی بزرگ شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے قول کی روشنی میں اقبال نے شعور نبوت اور شعور ولایت کے فرق کو واضح کرتے ہیں۔ شیخ موصوف کے الفاظ ہیں کہ محمد عربیؐ فلک الافلاک پر تشریف لے گئے اور واپس تشریف لائے۔ خدا کی قسم اگر میں اس مقام تک جاتا تو ہرگز واپس نہ آتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ صوفی نہیں چاہتا کہ وارداتِ اتحاد میں اسے جو لذت وسکون حاصل ہوتا ہے اسے چھوڑ کر واپس آئے۔ لیکن اگر آئے بھی جیسا کہ اس کا آنا ضروری ہے تو اس سے نوع انسانی کیلئے کوئی خاص نتیجہ مرتب نہیں ہوتا۔ برعکس اس کے نبی کی بازآمد تخلیقی ہوتی ہے اور وہ اس واردات سے واپس آتا ہے تو اس لیے کہ زمانہ کی رو میں داخل ہوجائے اور پھر ان قوتوں کے غلبہ وتصرف جو تاریخ عالم کی صورت گر

ہیں۔ مقاصد کی ایک نئی دنیا پیدا کرے۔ صوفی کے لیے لذت اتحاد ہی آخری چیز ہے۔ لیکن انبیاء کے لیے اس کا مطلب ان کی اپنی ذات میں کچھ اس قسم کی نفسیاتی قوتوں کی بیداری ہے جو دنیا کو زیروزبر کر سکتی ہیں اور جن سے کام لیا جائے تو جہان انسان دگرگوں ہو جاتا ہے۔ ۵ اقبال کی اس تعبیر کی روشنی میں ہم اس معنوی ربط کو سمجھ سکتے ہیں جو معراج نبوی اور ہجرت میں ہے جو ایک ہمہ جہتی عالمگیر انقلاب کا نقطۂ آغاز بنتا ہے۔

رسالت محمدیہ کا مقصود بنی نوع آدم کی تاسیس وحریت و مساوات و اخوت ہے اور عالمگیر بنیادوں پر ساری دنیائے انسانیت کو منقلب کرنا اس کا نصب العین ہے۔ چونکہ حضور اکرمؐ کے ذریعہ جو پیغام دیا گیا وہ آخری ہے اس لیے اس میں وہ تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں جن کے بعد مزید وحی اور رسالت کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اس طرح اقبال عقیدۂ ختم نبوت سے اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ یہ ایک شیرازہ بند قوت ہے جس کی وجہ سے یہ ساری امت رنگ ونسل قوم و وطن کے فطری اختلافات کے باوجود ایک رشتۂ وحدت میں منسلک ہے۔ اس حقیقت کی تکمیل کے بعد جو ملتیں قائم ہوں گی وہ آئین فطرت کے خلاف ہوں گی اور کوئی جدید دعویٰ نبوت اس وحدت کو انتشار میں بدلنا ہے۔ گویا اسلام وحدت ختم نبوت سے استوار ہوتی ہے اور ملت کی حیات اجتماعیہ کا دارومدار رسول اکرمؐ کی ذات گرامی سے وابستگی پر ہے۔

اقبال کہتے ہیں کہ ''اسلام بہ حیثیت دین کے خدا کی طرف سے ظاہر ہوا لیکن اسلام بہ حیثیت سوسائٹی یا ملت کے رسول اکرمؐ کی شخصیت کا مرہون منت ہے''۔ ٦

تصور خاتمیت کا ایک اور اہم نتیجہ یہ ہے کہ اب کوئی شخص کسی مافوق الفطرت روحانی تجربہ کے دعویٰ کی بنیاد پر کسی کو اپنی اطاعت پر مجبور نہیں کر سکتا۔ یہ تصور ایک طرح کی نفسیاتی قوت ہے جس سے اس قسم کے دعووں کا قلع قمع ہو جاتا ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا قانون عطا کر کے جو ضمیر انسانی کی گہرائیوں میں ظہور پذیر ہوتا ہے آزادی کا راستہ دکھا دیا ہے۔ ان کے بعد کسی اور انسانی ہستی کے آگے روحانی حیثیت سے سر تسلیم خم نہیں کیا جا سکتا۔

اس طرح اس پیام آخریں کے بعد کوئی اس بات پر مکلف نہیں ہے کہ کسی کی روحانی پیشوائی کو قبول کرے اور کسی کا روحانی تجربہ کوئی اجتماعی اہمیت نہیں رکھتا۔ اقبال کے خیال میں ایک

کامل الہام اور وحی کے بعد کسی اور الہام دوحی کی اطاعت غلامی ہے۔ دراصل نبی آخرالزماں ؐ کی اطاعت غلامی نہیں بلکہ آزادی ہے کیوں کہ اس نبوت کے احکام دین فطرت ہیں یا فطرت صحیحہ خود بخود ان کو قبول کرتی ہے۔ فطرت صحیحہ کا انہیں خود بخود قبول کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ احکام زندگی کی گہرائیوں سے پیدا ہوتے ہیں۔ یہ ایسے احکام نہیں جن کو ایک مطلق العنان حکومت نے ہم پر عائد کر دیا ہو اور جن پر ہم محض خوف سے عمل کرنے پر مجبور ہوں۔ ے

اس بات کی مزید وضاحت کرتے ہوئے اقبال کہتے ہیں کہ وحی محمدیؐ کے بعد کسی اور الہام کی حیثیت محض ثانوی ہے۔ سلسلہ الہام تو جاری رہے گا۔ مگر وحی محمدیؐ کے بعد کوئی الہام حجت نہیں ہے سوائے اس شخص کے جس کو الہام ہوا ہے۔ بالفاظ دیگر وحی محمدی کے بعد کوئی الہام ایک پرائیوٹ Fact ہے۔ اس کا کوئی سوشیل مفہوم یا وقعت نہیں ہے۔ ۸

اقبال کے خیال میں انسانیت کی تمدنی تاریخ میں ختم نبوت کا تخیل سب سے انوکھا ہے اور اس کا صحیح اندازہ مغربی اور وسط ایشیا موبدانہ تمدن Magian Culture کی تاریخ کے مطالعہ سے ہوسکتا ہے۔ موبدانہ تمدن میں زرتشتی، یہودی، نصرانی اور صابی تمام مذاہب شامل ہیں ان تمام میں نبوت کے اجزاء کا تخیل نہایت لازم تھا۔ چنانچہ ان پر مستقل انتظار کی کیفیت طاری رہتی تھی۔ اس کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ نئے مذہبی تجربات اور مہمات کا سلسلہ جاری رہتا۔ اسلام نے اس مسلسل حالت انتظار سے نجات دلائی۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کسی منتظر یا موعود کی مجوسی تعبیر سے متفق نہیں ہیں۔ اس سلسلہ میں موجود روایات کے بارے میں ان کا نقطۂ نظر ابن خلدون کی تائید میں ہے کہ اسلامی دعوت کے لیے طاقت وشوکت کا وجود ناگزیر ہے اور ظاہر ہے کہ اس کا دار ومدار کسی فرد یا افراد کی جوہر قیادت پر ہی ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کسی نجات دہندہ یا موعود کے انتظار میں اپنے قوائے فکر وعمل کو خوابیدہ رکھا جائے۔

ختم نبوت کا ایک اور پہلو عقل استقرائی کی اہمیت کو تسلیم کرنا ہے۔ جب عقل نے آنکھ کھولی اور قوت تنقید بیدار ہوئی تو زندگی کا مفاد اس میں ہے کہ ابتدائی مراحل میں نفسی توانائی کا اظہار جن ماورائے عقل طریقوں سے ہوا تھا اس کا سلسلہ رک جائے۔ ختم نبوت سے پہلے شعور نبوت ایک طرح کی کفایت فکر کا نام ہے۔ ۹

ختم رسالت اس وجہ سے ممکن ہو سکی کہ عقل انسانی اس منزل پر پہنچ گئی تھی کہ وحی کی نیابت کر سکے۔ اس لیے اقبال اسلام کو عقل استقرائی کا ظہور قرار دیتے ہیں۔ پانچویں خطبہ ''اسلامی ثقافت کی روح'' میں اقبال کہتے ہیں کہ ''پیغمبر اسلام کی ذات گرامی کی حیثیت دنیائے قدیم اور جدید کے درمیان ایک واسطہ کی ہے بہ اعتبار اپنے سرچشمۂ وحی کے آپ کا تعلق دنیائے قدیم سے ہے لیکن بہ اعتبار اس کی روح کے دنیائے جدید سے۔ یہ آپؐ ہی کا وجود ہے جس کی وجہ سے زندگی پر علم و حکمت کے تازہ سرچشمے منکشف ہوئے جو اس کے آئندہ رخ کے عین مطابق تھے۔ لہٰذا اسلام کا ظہور استقرائی عقل کا ظہور ہے۔ اسلام میں نبوت اپنے آپ کو ختم کرنے کی ضرورت محسوس کر کے منتہائے کمال کو پہنچ جاتی ہے اسلام نے خوب سمجھ لیا تھا کہ انسان ہمیشہ سہاروں پر زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ اس کے شعور ذات کی تکمیل ہوگی تو یوں ہی کہ وہ خود اپنے وسائل سے کام لینا سیکھے یہی وجہ ہے کہ اسلام نے دینی پیشوائی کو تسلیم نہیں کیا یا موروثی بادشاہت کو جائز نہیں رکھا۔ بار بار عقل انسانی پر زور دینا یا عالم فطرت اور عالم تاریخ کو علم انسانی کا سرچشمہ ٹھیرانا ان سب کے اندر یہی نکتہ مضمر ہے کہ انسان اپنے وسائل سے کام لے اور اس کے قوائے فکر و عمل بیدار ہوں۔ یہ سب تصور خاتمیت ہی کے مختلف پہلو ہیں''۔[10]

عقل استقرائی کے سلسلہ میں بعض گوشوں سے اٹھائے گئے اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے اقبال نے یہ وضاحت کی تھی کہ تصور خاتمیت سے غلط فہمی نہ پیدا ہونی چاہئے کہ زندگی میں اب صرف عقل ہی کا دخل ہے۔ اس کا مطلب صرف یہی ہے کہ واردات باطن کی کوئی بھی شکل ہو ہمیں اس بات کا حق پہنچتا ہے کہ عقل و فکر سے کام لیتے ہوئے اس پر آزادی سے تنقید کریں۔ اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ انسانی فطرت کامل ہو اور اپنی ذاتی محنت سے حاصل کردہ علم کے ذریعہ سے انسان میں اعتماد پیدا ہو۔ اقبال کہتے ہیں کہ وحی کا Function حقائق کا انکشاف ہے یا یوں کہیے کہ وحی حصول علم میں جو Time کا عنصر ہے اس کو خارج کرنے کی ایک ترکیب ہے۔ انسان کی ترقی کے ابتدائی مراحل میں اس ذریعہ علم کی بے انتہا ضرورت تھی کیوں کہ ان مراحل میں انسان کو ان مقامات کے لیے تیار کیا جا رہا تھا۔ جن پر پہنچ کر وہ قوائے عقلیہ کی تنقید سے خود اپنی محنت سے علم حاصل کرے۔ محمدؐ عربی کی پیدائش ارتقاء کے اس مرحلہ پر ہوئی جب کہ انسان کو

استقرائی علم سے روشناس کرنا مقصود تھا۔ ۱۱ اسلام میں ایمان اور عقل کے توازن کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک طرف تو یہ دین ابدی اصولوں پر قائم ہیں اور دوسری طرف وہ خود اپنی تجدید و احیاء کے ذرائع کا حامل ہے۔ اس طرح کہ اس میں روح عصر کی عکاسی ہوتی رہے۔

ختم نبوت کا ایک فیضان اسی امت کی تشکیل ہے جو نہ تو Space bound مکان کی پابند ہے اور نہ Time bound زماں کی پابند ہے اسی لئے اقبال ختم نبوت کو ملت اسلامیہ پر ایک احسان تصور کرتے ہیں۔

پس خدا بر ما شریعت ختم کرد   بر رسولِ ما رسالت ختم کرد
رونق از ما محفل ایام را   اُو رسل را ختم و ما اقوام را
خدمت ساقی گری باما گذاشت   داد ما را آخریں جامے کہ داشت
''لا نبی بعدی'' ز احسانِ خدا است   پردۂ ناموسِ دینِ مصطفیٰ است

(رموز بے خودی ص ۱۱۸)

یہ ملت نہ تو کسی خاص گروہ سے وابستہ ہے اور نہ کسی خطۂ ارض سے اور نہ اس کی حیثیت کسی Closed entity کی ہے بلکہ ساری انسانیت کا استخلاص اس کا منصب ہے چونکہ اس منصب میں تدریجی مگر اساسی انقلاب کی طرف مسلسل صعود ہے جس کی طرف اقبال نے اشارہ کیا ہے اسی لیے اس کو دوام ہے جو گروہ اس پیام کو تھامنے کی اہلیت کھو دیتا ہے اور اپنے دور کے تقاضوں سے غافل ہو کر جمود کا شکار ہو جاتا ہے تو یہ امانت اس سے چھن کر دوسروں کے ہاتھوں میں منتقل ہو جاتی ہے۔ لیکن اس وقت مکانی اور زمانی تسلسل باقی رہتا ہے اس کا جوہر کسی مقام سے وابستہ نہیں ہے۔

جوہر ما با مقامے بستہ نیست   بادۂ تندش بہ جامے بستہ نیست
ہندی و چینی سفالِ جام ماست   قلب ما از ہند و روم و شام نیست
مرز و بوم ما بجز اسلام نیست

(رموز بے خودی ۱۲۹)

یہاں اقبال نے واقعہ ہجرت کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اس کی بلیغ توجیہ یوں کی ہے

کہ ہجرت کا محرک دشمنوں کے نرغہ سے بچ نکلنے کی خواہش نہ تھی بلکہ دراصل یہ زمین پیوستگی Earth rootedness کے خلاف ایک اظہار اور تسخیر کل کا عزم ہے۔ تنک آبی سے گزر کر تسخیر یم کا نام ہے۔

پس چرا از مسکنِ آباء گریخت	تو گماں داری کہ از اعداء گریخت
قصوہ گویاں حق زما پوشیدہ اند	معنیٔ ہجرت غلط فہمیدہ اند
ہجرت آئینِ حیات مسلم است	ایں ز اسباب ثباتِ مسلم است
معنیٔ اُواز تنک آبی رم است	ترکِ شبنم بہرِ تسخیر یم است
بایدت آہنگ تسخیر ہمہ	تا تومی باشی فراگیر ہمہ

(رموز بے خودی ۱۳۱)

قید مکانی سے آزادی کے علاوہ یہ ملت خود اپنی تجدید و حرکت کے ذرائع کی حامل ہے۔ حیاتیاتی اعتبار سے نئے خلیئے پیدا ہوتے اور فنا ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن جسم باقی رہتا ہے اس طرح یہ ملت محض مخصوص گروہ کے افراد سے وابستہ نہیں بلکہ اس کے پیام کا دوام ہے۔

از اجل ایں قوم بے پرواستے	استوار از نحن نزلنا ستے
ذکر قائم از قیام ذاکر است	از دوامِ او دوام ذاکر است

(رموز بے خودی ۱۳۷)

اس ملت کی تاریخ اس بات پر گواہی دیتی ہے کہ انقلابات کے ہجوم اور داخلی و خارجی حملوں کی زد سے یہ سلامت بچ نکلی ہے۔ طاقت اور توانائی کے لئے دھارے اس میں شامل ہو کر اس کی روانی کو برقرار رکھتے رہے ہیں۔

آتشِ تاتاریاں گلزار کیست	شعلہ ہائے اُو گل دستار کیست
از تہہ آتش بر اندازیم گل	نارِ ہر نمرود را سازیم گل
شعلہ ہائے انقلابِ روزگار	چوں بباغِ ما رسد گردد بہار

(رموز بے خودی ۱۳۸)

اقبال کے ہر دور کے کلام میں یہ کرب و اضطراب جھلکتا ہے کہ وہ گروہ جو اس پیام

آخریں سے اپنے آپ کو وابستہ سمجھتا ہے وہ ختم نبوت کے نتیجہ میں زمان و مکان سے آزادی کے اس مفہوم سے بیگانہ اور اقدام و حرکت کی صلاحیت سے عاری ہو چلا ہے۔ زندگی جاوداں، رواں دواں ہے، اقبال نے بتایا کہ نجات کسی منفی ابدیت میں سکون کی تلاش نہیں بلکہ اسے حرکت و تغیر کے رمز سے بھی آگاہ ہونا ہے۔ چنانچہ اقبال کہتے ہیں۔ اسلام کے اس بنیادی تصور کے پیش نظر کہ وحی کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند ہے لہذا اب کوئی وحی نہیں کہ ہم اس کے مکلف ٹھہریں، ہماری جگہ دنیا کی ان قوموں میں ہونی چاہئے جو روحانی اعتبار سے سب سے زیادہ آزادی حاصل کر چکی ہوں۔ شروع شروع کے مسلمان تو جنہوں نے ایشیائے قبل اسلام کی روحانی غلامی سے نجات حاصل کی تھی۔ اسلام کے اس تصور کی ٹھیک ٹھیک حقیقت سمجھنے سے قاصر رہے۔ لیکن ہمیں چاہیے کہ آج اپنے اس موقف کو سمجھیں اور اپنی حیات اجتماعیہ کی از سر نو تشکیل اسلام کے بنیادی اصولوں کی رہنمائی کریں تا آنکہ اس کی وہ غرض و غایت جو ابھی تک صرف جزواً ہمارے سامنے آئی ہے یعنی اس روحانی جمہوریت کا نشو و نما جو اس کا مقصود و منتہی ہے تکمیل کو پہنچ سکے۔ [۱۲]

☆☆☆

حوالہ جات:

(۱) خطبات، ترجمہ سید نذیر نیازی، صفحہ ۲۲۳ (۲) مضامین اقبال، مرتبہ تصدق حسین تاج، صفحہ ۱۸۳۔ (۳) انوار اقبال، مرتبہ بشیر احمد ڈار، صفحہ ۴۵۔ (۴) خطبات، صفحہ ۱۹۰ (۵) خطبات، صفحہ ۱۸۸۔ (۶) حرف اقبال، صفحہ ۱۳۶ (۷) مضامین اقبال، صفحہ ۱۵۴ (۸) انوار اقبال، صفحہ ۴۶ (۹) خطبات، صفحہ ۱۹۶ (۱۰) خطبات، صفحہ ۱۹۳ (۱۱) انوار اقبال صفحہ ۴۸ (۱۲) خطبات، صفحہ ۲۷۶۔

امت میں اختلاف رائے کے آداب وحدود

اسوہ حسنہ ﷺ کی روشنی میں

آج کے دور میں ناسازگار اور ناموافق حالات، آزمائشوں اور اغیار کی سازشوں کے درمیان ہر دردمند دل کی پکار یہی ہے کہ۔ قافلۂ حجاز کے حدی خواں کہاں ہیں؟ اقبال نے یہ بھی سوال کیا تھا۔

منزل راہرواں دور بھی دشوار بھی ہے
کوئی اس قافلہ میں قافلہ سالار بھی ہے؟

قیادت کے دعویدار تو بہت ہیں۔ منصب اور عہدہ کے طلب گار تو کئی ہیں۔ اپنے موقف کو درست ثابت کرنے کیلئے مضامین کے انبار بھی لگائے جاتے ہیں۔ بیانات کا سلسلہ جاری رہتا ہے لیکن صورتحال یہ ہے کہ۔

میرِ سپاہ ناسزا لشکریاں شکستہ صف
آہ! وہ تیرنیم کش جس کا نہ ہو کوئی ہدف

یوں تو اختلاف رائے ہر دور میں رہا ہے۔ ایک دوسرے کے نقاطِ نظر کو سمجھنے میں رکاوٹیں موجود رہی ہیں۔ لیکن سوال یہی ہے کہ اختلاف رائے کے جائز حدود کیا ہیں کیا ان حدود کو پھلانگ کر اختلاف کو انتشار بلکہ افتراق میں بدلا جائے۔ آپس میں ذاتی حملوں کو روا رکھا جائے۔ برسر عام نکتہ چینی ہی نہیں بلکہ کردارکشی کی جائے۔ ایک تکثیری سماج میں جہاں اور مذاہب اور مختلف نقاطِ نظر رکھنے والے لوگ بھی بستے ہیں۔ کیا ہمارا ضمیر اس صورتحال کو گوارا کرسکتا ہے۔

خندہ زن کفر ہے، احساس تجھے ہے کہ نہیں؟

موجودہ تناظر میں مسلم قیادت پر اقبال کا یہ تبصرہ بڑا جامع ہے۔ ''علماء میں مداہنت آگئی ہے۔ یہ گروہ حق کہنے سے ڈرتا ہے۔ صوفیا اسلام سے بے پروا اور حکام کے تصرف میں ہیں۔ اخبار نویس اور آج کل کے تعلیم یافتہ لیڈر خود غرض ہیں اور ذاتی منفعت اور عزت کے سوا کوئی

مقصد ان کی زندگی کا نہیں۔ عوام میں جذبہ تو موجود ہے مگر ان کا کوئی بے غرض رہنما نہیں ہے۔''
(مکتوب اقبال ۲۰ جولائی ۱۹۳۷ء) اقبال نامہ ۲۴۹)

اس ناخوشگوار اور تکلیف دہ اور دکھ بھری باتوں کو طول دینا مقصود نہیں ہے۔ اس صورت حال کے ذمہ دار وہ لوگ بھی ہیں جو کسی جماعت کسی گروہ یا کسی تنظیم کے ارباب بست وکشاد ہیں۔ جن میں اکثر کے نزدیک کشادہ قلبی، وسعت نظر، تحمل شاید بے معنیٰ الفاظ ہیں یا ہوں بھی تو ان کی اپنی تاویلات اور منطق سلجھاؤ کے بجائے الجھاؤ پیدا کر دیتی ہیں۔ وہ لوگ بھی ذمہ دار ہیں جو قیادت سے کسی اختلاف کی بنیاد پر ایسی صورتحال پیدا کر دیتے ہیں جو روا نہیں رکھی جاسکتی۔ وہ یہ باور کرتے ہیں قیادت کی غلطی کی اصلاح ان پر فرض عین ہے۔ اکثر صورتوں میں اس اختلاف کی بنیاد انا یا خود پسندی ہوتی ہے۔ اپنی رائے کو ہی حقیقی اور درست سمجھنا۔ اپنی رائے پیش کر دینے کے بعد اس پر اتنا اصرار کہ بات اختلاف سے بڑھ کر افتراق تک پہنچ جائے۔

امت کا ہر فرد ہر مسئلہ میں قرآن مجید کے حکم اور تعلیمات کو برحق مانتا ہے ان پر یقین رکھتا ہے اور محسن انسانیت ﷺ کے اسوۂ حسنہ کو واجب التسلیم نہیں واجب التعمیل مانتا ہے۔ اس ذات گرامیؐ سے محبت کا دعویٰ کرتا ہے۔ اگر ٹھنڈے دل سے غیر جانبدارنہ اور غیر جذباتی انداز سے نیک نیتی سے ہدایت کے ان ابدی سرچشموں سے رجوع کرتے ہوئے اپنا محاسبہ کریں تو ہمیں رہنمائی حاصل ہوسکتی ہے۔

پہلی بات تو یہ سمجھنے کی ہے کہ قیادت خود ساختہ نہیں ہوتی۔ قیادت تسلیم کی جاتی ہے منوائی نہیں جاتی۔ کہا گیا ہے سید القوم خادمھم۔ (قوم کا سردار ان کا خادم ہوتا ہے) قیادت محض ذہانت کا نام نہیں، قیادت محض خطابت کا نام نہیں۔ اقبال نے قیادت کے اوصاف ان الفاظ میں بیان کئے تھے۔

نگہ بلند، سخن دلنواز، جاں پُر سوز
یہی ہے رختِ سفر میر کارواں کیلئے

ایک اور مقام پر اقبال نے کہا تھا

چہ باید مرد را طبعے بلندے، مشربے نالے

دل گرے ، نگاہ پاس بینے ، جانِ بیتاب ہے

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا۔ بخدا ہم اپنی حکومت کا منصب کسی ایسے شخص کو نہیں دیتے جو اس کا طالب یا حریص ہو، حضورؐ نے ایک بار امارت کا سلسلہ میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کے استفسار پر فرمایا ''وہ اس کے لئے جو اس سے بے رغبت ہو، نہ اس کے لئے جو اس پر ٹوٹا پڑتا ہے۔ وہ اس کے لئے جو اس سے بچنے کی کوشش کرے۔ نہ کہ اس کے لئے جو اس پر جھپٹے۔ وہ اسی کے لئے ہے جس سے کہا جائے یہ تیرا حق ہے۔ نہ کہ اس کے لئے جو خود کہے یہ میرا حق ہے۔'' حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا۔ میرے بعد تم لوگ خود غرضی اور ایسے امور دیکھو گے جو ناپسند ہوں گے۔ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا۔ یارسول اللہ ﷺ ہم سے جو لوگ اس زمانہ کو پالیں تو آپ کیا حکم دیتے ہیں؟ فرمایا۔ ''تم پر جو حق ہے اسے ادا کردو اور تم اپنا حق اللہ سے طلب کرو۔ (مسلم) حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: میں اس مومن کے لئے جنت کے کنارے ایک محل کا ضامن ہوتا ہوں جو حق پر ہونے کے باوجود جھگڑا چھوڑ دے۔'' (ابوداؤد)

اختلاف سے بڑھ کر افتراق کی بنیاد قرآن مجید کی رو سے ہوائے نفس ہے، قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے کیا تم نے اس شخص کو نہیں دیکھا جس نے اپنی ہوائے نفس کو اپنا معبود بنا لیا ہے۔ قرآن مجید میں دیگر مقامات پر تاکید کی گئی ہے کہ۔ خواہشِ نفس کی اتباع نہ کرو کہ راہ عدل سے ہٹ جاؤ۔ خواہش نفس اللہ کی راہ سے بھٹکا دیتی ہے۔

یہ شیطان کا ایک فریب ہے کہ وہ ہمارے غلط کاموں کو بھلا بنا کر دکھاتا ہے اور ہم اسے درست سمجھتے ہیں۔ نفسانیت، خود پسندی، ہٹ دھرمی، غلو، اختلاف کو برداشت نہ کرنا، جاہ پرستی، مشورت سے گریز، وغیرہ وغیرہ اسی ہوائے نس کی ذریات ہیں۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے پیارے حبیب ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں آپ کو کئی مثالیں ایسی ملیں گی جہاں آپ نے حسن تدبر اور خوش معاملگی سے صحابہ کرام کے ٹوٹے دلوں کو جوڑ دیا۔ شیطان نے ان کے دلوں میں وسوسے پیدا کر کے ناراضگی کی جو صورت حال پیدا کر دی تھی اس کو نہ صرف دور فرمایا بلکہ دل کی دنیا بدل دی۔

صلحہ حدیبیہ کے موقع پر جب کہ صحابہ کرامؓ کے دل اس معاہدہ کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہ تھے

چونکہ ان کا خیال تھا کہ معاہدہ کے شرائط سے دب کر صلح کرنے کا اظہار ہوتا ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ معاہدہ صلح لکھوا کر فارغ ہو چکے تو صحابہؓ سے فرمایا اٹھو اور اپنے اپنے جانور کی قربانی دے دو لیکن کوئی آمادہ نہ ہوا۔ دیکھئے کتنی نازک صورتِ حال تھی۔ پھر آپؐ نے ام المومنین ام سلمہؓ سے تذکرہ فرمایا۔ حضرت ام سلمہؓ نے مشورہ دیا کہ آپ کسی سے کچھ کہے بغیر اپنا جانور ذبح کر دیجئے اور سر منڈوا لیجئے۔ آپؐ کے اس عمل کو دیکھ کر صحابہ کرامؓ نے اس کی اتباع فرمائی۔ اسی طرح کا ایک اور واقعہ جعرانہ میں اموال غنیمت کے موقع پر انصار کے نوجوانوں کا اضطراب اور رنجیدگی ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے قریش اور قبائل عرب میں مال غنیمت تقسیم فرما دیا اور انصار کو کچھ نہ دیا۔ اس تقسیم کے پیچھے تالیف قلبی اور ایک خاص حکمت عملی پوشیدہ تھی جسے انصار سمجھ نہ سکے وہ اپنے دل میں پیچ و تاب کھاتے رہے ور چہ میگوئیاں ہوتی رہیں۔ اس کی اطلاع جب حضور اکرم کو ملی تو آپؐ نے انصار کے سردار حضرت سعد بن عبادہؓ سے فرمایا کہ انصار کو ایک خیمہ میں اکٹھا کریں۔ جب انصار ایک جگہ جمع ہو گئے تو آپؐ ان کے پاس تشریف لائے۔ اب زبانِ رسالت مآب ﷺ نے جس حکیمانہ انداز اور دلسوزی سے خطاب فرمایا وہ سیرتِ طیبہ کا ایک درخشاں باب ہے۔ آپؐ نے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی حمد وثناء کے بعد فرمایا۔ اے انصار کے لوگو! تمہاری یہ کیا چہ میگوئی ہے جو میرے علم میں آئی ہے۔ اور یہ کیا ناراضگی ہے جو جی ہی جی میں تم نے مجھ پر محسوس کی ہے؟

اب دیکھئے کس طرح انصار کے دلوں کو آپؐ نے پلٹا دیا؟ آپؐ نے فرمایا کیا ایسا نہیں ہے کہ میں تمہارے پاس اس حالت میں آیا تھا کہ تم گمراہ تھے؟ اللہ تمہیں میرے ذریعہ سے ہدایت دی اور تم محتاج تھے اللہ نے تمہیں غنی بنایا۔ تم باہم دشمن تھے اللہ نے تمہارے دل جوڑے، لوگوں نے کہا کیوں نہیں؟ اللہ اور اس کے رسول کا بڑا فضل وکرم ہے۔

اس کے بعد حضور اکرم ﷺ نے فرمایا انصار کے لوگو! مجھے جواب کیوں نہیں دیتے؟ انصار نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ! بھلا ہم آپ کو کیا جواب دیں، اور اور اس کے رسول کا فضل وکرم ہے۔ اب آگے دلوں کو تڑپا دینے والا خطاب ہے، آپؐ نے فرمایا دیکھو! خدا کی قسم اگر تم چاہو تو کہہ سکتے ہو۔ اور سچ ہی کہو گے اور تمہاری بات سچ ہی مانی جائے گی۔ تم کہو کہ آپؐ ہمارے پاس اس حالت میں آئے تھے کہ آپ کو جھٹلایا گیا تھا ہم نے آپ کی تصدیق کی۔ آپ کو بے یار ومددگار

چھوڑ دیا گیا تھا۔ ہم نے آپؐ کی مدد کی۔ آپؐ کو گھر سے نکال دیا گیا تھا ہم نے آپ کو ٹھکانہ دیا۔ آپؐ محتاج تھے ہم نے آپ کی غمخواری و غم گساری کی۔

''اے انصار کے لوگو! تم اپنے جی میں ایک حقیر سے گھاس (متاع) کے لئے ناراض ہوگئے جس کے ذریعہ میں نے لوگوں کا دل جوڑا تھا تا کہ وہ مسلمان ہو جائیں اور تم کو تمہارے اسلام کے حوالہ کر دیا تھا۔ اے انصار! کیا تم اس بات سے راضی نہیں؟ لوگ اونٹ اور بکریاں لے کر جائیں اور تم رسول اللہ ﷺ کو لے کر اپنے ڈیروں میں پلٹو؟ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں محمدؐ کی جان ہے، اگر ہجرت نہ ہوتی تو میں بھی انصار ہی کا ایک فرد ہوتا۔ اگر سارے لوگ ایک راہ چلیں اور انصار دوسری راہ چلیں تو میں بھی انصاری کے راہ چلوں گا۔ اے اللہ! انصار پر رحم فرما اور انصار کے بیٹوں اور انصار کے بیٹوں کے بیٹوں (پوتوں) پر۔ رسول اللہ ﷺ کا خطاب سن کر لوگ اس قدر روئے کہ داڑھیاں تر ہوگئیں۔ اور کہنے لگے۔ ہم راضی ہیں کہ ہمارے حصے اور نصیب میں رسول اللہ ﷺ ہوں۔

اختلاف امت کے ضمن میں اسوۂ حسنہ کے اس پہلو کو پیش کرنے کا مقصد یہی ہے کہ ہم اس بات کو سمجھ سکیں کہ جب اختلاف پیدا ہوتا ہے تو کس طرح اسوۂ حسنہ سے ہمیں رہنمائی حاصل ہوتی ہے۔

اس اسوۂ حسنہ کو صحابہ کرامؓ تابعین اور اس کے بعد آنے والوں نے ہمیشہ پیش نظر رکھا۔ کسی مسئلہ پر اختلاف رائے ایک فطری امر ہے۔ لیکن اس کو تفرقہ کا ذریعہ کبھی گوارا نہیں کیا جا سکتا۔

غزوۂ بدر کے موقع پر جنگی قیدیوں کے بارے میں جب مشورہ کیا گیا تو حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کی رائے مختلف تھی۔ مانعین زکوۃ کے بارے میں بھی دونوں کا موقف الگ الگ تھا۔ لیکن کیا یہ امور کبھی بھی ملت کے اندر انتشار کا سبب بنے۔ کسی نے حضرت عمرؓ سے کہا آپ ابو بکرؓ سے بہتر ہیں تو وہ رو پڑے اور فرمایا۔ بخدا ابو بکرؓ کی ایک رات عمرؓ اور آل عمرؓ سے بہتر ہے۔ حضرت علیؓ کے بارے میں حضرت عمرؓ نے فرمایا اگر علیؓ نہ ہوتے تو عمرؓ ہلاک ہو جاتا۔ آج شریعت کی مختلف آراء پر جھگڑے ہوتے ہیں۔ مسجدیں بھی محفوظ نہیں ہیں لیکن حضرت امام مالک کی موطا جو آپ کی چالیس سالہ محنت کا حاصل تھی، خلیفہ منصور نے عالم اسلام میں عام کرنا چاہا تو آپ نے اجازت

نہیں دی۔

کتنی باتیں ہیں جو عرض کی جاسکتی ہیں۔اگر دل آمادہ ہو اور ذہن فکرِ صحیح کو قبول کرنا چاہتا ہوا، گر واقعی ملت کا درد ہو اور مسلم امت کے خلاف ہونے والی سازشوں کا احساس ہو تو ہمارا رویہ معتدل ہو جائے۔فریبی حکومتوں کی کوشش ہوتی ہے کہ امت کے اندر اختلافات پیدا کئے جائیں اور انہیں ہوا دی جائے۔اس مقصد کی تکمیل کیلئے وہ ایسے افراد کو چن لیتی ہیں جو ان کے مقاصد کی تکمیل میں مدد دے سکیں یا ان کا آلہ کار بن سکیں ایسے افراد کو وہ انعامات اور اعزازات سے نوازتے ہیں۔

ان باتوں کے تذکرہ کا مقصد یہی ہے کہ کا ہم معاملات کی نزاکت کو سمجھ سکیں۔اور ہمارا کوئی قدم دشمنوں کے ہاتھ مضبوط کرنے کا سبب نہ نبے۔یہ تو ہوسکتا ہے کہ ہم خود ناروا تنقیدوں سے بچیں۔وہ لوگ جو خواہی یا نہ خواہی قیادت کے منصب پر فائز ہیں بجائے ہٹ دھرمی کے باہمی مشورت کے اہمیت کو سمجھیں جس کی تاکید قرآن مجید میں آئی ہے۔حضور اکرمؐ کا فرمان ہے جس نے مشورہ کیا اسے ندامت نہیں ہوتی۔رضائے رب کی باتیں تو ہوتی ہین لیکن کیا رضائے رب کے نام پر ہمارا اختلاف تفرقہ کو بڑھاوا دیتا ہے تو شاید یہ ضروری ہوگا کہ سارا معاملہ اللہ پر چھوڑیں ۔ملت کی فلاح کے ڈھیر سارے کام ہیں۔جس طریقہ کار اور کام کو آپ درست سمجھتے ہیں اس کو اپنی بساط اور صلاحیت کے مطابق انجام دینے کی کوشش کریں۔

☆☆☆

اقبال کا مطالعہ کیوں؟

(۹ جون ۱۹۷۳ء کو کل ہند مجلس تعمیر ملت کے زیر اہتمام منعقدہ نوجوانوں کے تربیتی اجتماع میں کی گئی ایک تعارفی تقریر کی تلخیص)

گذشتہ تین دن سے آپ عقیدہ توحید اور آخرت اور حضور اکرمؐ کی سیرتِ طیبہ پر صدر محترم (جناب سید خلیل اللہ حسینی صاحب) کے عالمانہ خیالات سماعت فرمار ہے ہیں۔ تنظیم کے نصب العین، ملک کے موجودہ حالات اور مسلمانوں کے مسائل کا دقتِ نظر سے آپ نے جائزہ لیا ہے۔ اس سارے پروگرام کے درمیان اقبال کا نام شاید آپ میں سے بعض کو کچھ بے جوڑ سا معلوم ہورہا ہوگا کہ تربیتی کیمپ کے ان اجتماعات میں اقبال پر گفتگو کا یہ کونسا موقع ہے؟ تنظیم کے قدیم ساتھی اس بات سے واقف ہیں کہ جس وقت تعمیر ملت نے بزم احباب کے نام سے اپنے کام کا آغاز کیا تھا۔ اس وقت شاید ہی کوئی علمی یا ادبی محفل ایسی رہتی ہو جس میں کم از کم کلام اقبال بالالتزام نہ پڑھا جاتا ہو۔ ان محفلوں میں اقبال پر مضامین بھی پڑھے جاتے تھے۔ تقسیم ہند کے بعد جب کہ اقبال کا نام لینا فرقہ پرستی اور رجعت پسندی کی علامت بن گیا تھا۔ یہ تعمیر ملت ہی تھی جس نے اقبال کے نام اور اس کی فکر کو جاری رکھا اور یہ بتایا کہ اقبال کے پیام کو کسی خاص علاقہ تک محدود نہیں کیا جاسکتا بلکہ ان کا خطاب ساری انسانیت سے ہے اور اس میدان میں ایسی یادگاریں چھوڑ دیں جو ہندوستان میں اپنی نظیر آپ ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تعمیر ملت نے اقبال کی شاعری اور ان کے افکار پر اتنا زور کیوں دیا۔ آج میری یہ مختصری گذارشات اسی سوال کے جواب پر مبنی ہیں۔

وہ جو اقبال کی عظمت کے قائل ہیں اور وہ جو اس کی بعض باتوں یا نظریات سے اتفاق نہیں رکھتے، دونوں کو اس بات کا اعتراف کہ کسی اور شاعر نے اپنے عہد کو اتنا متاثر نہیں کیا۔ یہی

نہیں بلکہ اقبال کی شاعری اور افکار آئندہ نسلوں پر اثر انداز ہوتے رہیں گے۔ اقبال کی عظمت کو پرکھنے کے لئے مختلف لوگوں نے مختلف معیارات مقرر کر رکھے ہیں۔ اپنے اپنے جداگانہ حالات کے پس منظر مین ان کی فکر کی تاویلات کی جاتی رہی ہیں۔ لیکن ہمارے نزدیک ان کی عظمت، ان کے پیام اور کلام کی اہمیت اس لئے ہے کہ وہ اسلام کی ابدی صداقتوں کے علمبردار ہیں۔ یہ موقع نہیں کہ مختلف انداز میں کہی جانے والی ان باتوں کے پس منظر کو واضح کیا جائے لیکن اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کم از کم اقبال کو خود اقبال کے کلام کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی جائے۔

اسلام سے اقبال کی وابستگی محض اس لئے نہیں تھی کہ وہ ایک پیدائشی مسلمان تھے بلکہ انہوں نے اپنے دور کے اضطراب اور بے چینی کا گہری نظر سے جائزہ لیا۔ مغرب کے افکار کا انہوں نے گہرا مطالعہ کیا۔ ان کا یہ دعویٰ شاعرانہ تعلّی نہیں۔

عذابِ دانشِ حاضر سے باخبر ہوں میں　　　کہ میں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثلِ خلیل

ایک اور موقع پر انہوں نے کہا۔

شوق میری لَے میں ہے شوق میرے نَے میں ہے

نغمۂ ''اللہ ہُو'' میرے رگ و پے میں ہے

انہوں نے کبھی اس بات کا دعویٰ نہیں کیا کہ انہوں نے دنیا کے آگے کوئی نئی بات پیش کی ہے یا کوئی نیا فلسفہ حیات مدون کیا ہے بلکہ انہوں نے کہا کہ قرآن کے پیغام کو اپنے دور کے تقاضوں کی روشنی میں پیش کیا ہے۔ ہر دور میں نئے مسائل سر اٹھاتے ہیں۔ نئے تقاضے جنم لیتے ہیں اور ضرورت اس بات کی رہتی ہے کہ عصری تقاضوں کے مطابق اسلام کی صداقتوں کو نئے انداز سے پیش کیا جائے۔ اقبال نے بھی اپنے دور میں اسلام کی ترجمانی کا یہی کام کیا۔ خود اقبال کی زندگی میں اقبال پر اعتراضات کئے جاتے رہے کہ انہوں نے اپنے نظام فکر میں مغرب کے فلاں فلاں مفکروں سے خوشہ چینی کی ہے اور آج بھی ایسے اعتراضات میں کوئی کمی نہیں ہوئی ہے۔ ہر بڑا شاعر یا مفکر اپنے عصر سے بے نیاز نہیں ہوسکتا۔ وہ اپنے دور کا پروردہ ہوتا ہے۔ اقبال نے ایک آزادانہ رائے رکھنے والے مفکر کی حیثیت سے مختلف نقاط نظر کا جائزہ لیا اور جہاں جہاں جزوی صداقتیں انہیں نظر آئیں ان کو سراہا۔ بلکہ جو بات اُن کے نظام فکر سے مطابقت رکھتی تھی اسے قبول

بھی کیا لیکن بنیادی طور پر انہوں نے کہا کہ اصل اور بنیادی صداقت قرآن مجید کی ابدی اور انسانیت نواز تعلیمات ہیں ۔ چنانچہ ایسے اعتراضات کرنے والوں کے بارے میں رموزِ بیخودی کے آخری حصہ ،عرض حال مصنف بحضور رحمۃ للعالمین ﷺ'' میں عرض کیا ہے کہ اگر ان کا دل ایک ایسا آئینہ ہے جس میں کوئی جوہر نہیں ہے اور اگر ان کی شاعری اور فکر میں قرآن کی صداقتوں سے ہٹ کر کوئی اور بات ہے تو انہیں روز محشر خوار و رسوا کیا جائے اور ان کے نزدیک ان کی رسوائی یہی ہوسکتی ہے کہ انہیں حضور اکرمؐ کے پائے مبارک کو بوسہ دینے کے شرف سے محروم کر دیا جائے۔

گر دلم آئینہ بے جوہر است　　در بحر فم غیر قرآن مضمر است
روزِ محشر خوار و رسوا کن مرا　　بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا

اتنی دیانتِ فکر سے کہی گئی بات کے بعد کس کو یہ کہنے میں تامل ہے کہ اقبال کا پیام قرآن سے ہٹ کر کچھ اور ہے ۔ پستی نصیب ،زوال آمادہ ،اور سکون پسند اپنی قوم کے سامنے انہوں نے یہی بات دہرائی کہ ان کے درد کا درماں مصائب میں ، ان کا حوصلہ ناتوانی میں ، ان کی قوت سوائے قرآن کے اور کچھ نہیں ہے۔

چیست قرآن خواجہ را پیغام مرگ
دستگیرِ بندۂ بے ساز وبرگ

ملتِ اسلامیہ کی موجودہ ذہنی پستی ،محکومی ، ذلت ، مسکنت اگر دور ہوسکتی ہے تو صرف اور صرف اس بات سے کہ مسلمان قرآن مجید کو تھام لیں ۔جس نے مردہ قوموں کو نئی زندگی دے کر عروج عطا کیا لیکن بدقسمتی سے ہم آج اس سے یہ کام لے رہے ہیں کہ مردہ کا دم سہولت سے نکل جائے۔

اقبال نے اپنے کلام میں جہاں قرآن مجید سے اکتساب ہدایت پر زور دیا، وہیں انہوں نے ان نام نہاد فقیہانِ حرم اور علمائے عالی مقام کے خلاف علم بغاوت بلند کیا جنہوں نے اپنی تاویلات سے قرآن کے پیام حرکت کو جامد بنا دیا اور اپنی نت نئی توجیہات کے ذریعہ ملت کو بے عمل بنا دیا ورنہ کیا سبب ہے کہ وہی قرآن ہمارے درمیاں موجود ہو، جس نے مختصر سے دور میں دنیا کی جاہل اور اجڈ ترین قوم کو امامت کے منصب پر سرفراز کر دیا ،لیکن آج ہمارے قوائے ذہن

وعمل میں کوئی جنبش نہ ہو۔

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق

یہی وجہ ہے کہ کل ہند مجلس تعمیر ملت کے نزدیک اقبال کے پیام کو عام کرنا، اسلام کی تعلیم کو عام کرنا ہے جو اس کا بنیادی مقصد ہے۔ جس طرح اقبال کی وطن دوستی اور آفاقیت میں کوئی تضاد نہیں ،اسی طرح اسلام اور اقبال کے تصورِ احترام آدمیت میں کوئی تضاد نہیں ہے۔

مطالعۂ اقبال کے سلسلہ میں میرے نزدیک دوسرا اہم پہلو ذاتِ رسالت مآبؐ سے عشق ہے۔ جہاں ایک مسلمان کی حیثیت سے رسولِ اکرمؐ کی ذات گرامی ان کا قبلۂ جان وایمان ہے وہیں اس سیرتِ پاک میں انسان کے سارے ممکنات کے ظہور کی معراج نظر آتی ہے۔ علی گڑھ کے مشہور پروفیسر رشید احمد صدیقی صاحب نے ایک جگہ اقبال کی نعتیہ شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ اقبال پر مذہب کی گرفت ہے لیکن دراصل اقبال پر سب سے بڑے انسانؐ کی گرفت ہے۔ اقبال کی نعتیہ شاعری کے بارے میں پروفیسر رشید احمد صدیقی کا یہ تبصرہ نہایت جامع وبرحق ہے۔

اقبال کے نعتیہ کلام خصوصاً فارسی کلام کا جواب نہیں ہے یہ ان کی شاعری کا دھڑکتا ہوا دل ہے۔ اردو کلام میں ''جواب شکوہ'' ہی کے ان چند اشعار کو پڑھئے تو روح وجد کرنے لگتی ہے۔

ہو نہ یہ پھول تو بلبل کا ترنم بھی نہ ہو
چمنِ دہر میں کلیوں کا تبسم بھی نہ ہو

یہ نہ ساقی ہو تو پھر مئے بھی نہ ہو خم بھی نہ ہو
بزم توحید بھی دنیا میں نہ ہو تم بھی نہ ہو

خیمہ افلاک کا استادہ اسی نام سے ہے
نبضِ ہستی تپش آمادہ اسی نام سے ہے

حضور پاکؐ کی ذات گرامی سے یہ عشق ووارفتگی، عقیدت وشیفتگی شاید خردمندوں کو ایک شخصی واردات نظر آئے۔ لیکن فلسفی اقبال ہی کو پڑھ جایئے۔ اپنے خطبات میں انہوں نے اس بات کو وضاحت کے ساتھ پیش کیا ہے کہ اسلام میں نبوتؐ اپنے آپ کو ختم کر کے منتہائے کمال کو پہنچ جاتی ہے۔ جہاں سفر الی اللہ میں حضورؐ کی ذات گرامی ساری انسانیت کے لئے منتہائے کمال ہے وہیں آپؐ نے ایک عالمگیر معاشرہ کی بنیاد رکھ دی جہاں اصلِ تہذیب احترام آدم ہے۔

اقبال نے اپنے کلام میں اس بات پر زور دیا ہے کہ حسنِ سیرت اسوۂ حسنہ کی پیروی ہی سے حاصل ہوسکتی ہے۔ حضور اکرمؐ کے بارے میں قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے کہ وہ انسانیت پر لدے ہوئے بوجھ اور ان کو جکڑے ہوئے طوق وسلاسل سے نجات دلاتے ہیں۔ اس اعتبار سے حضور اکرمؐ کا نام لیوا مظلوم محکوم، مجبور، بیکس ولاچار نہیں ہوسکتا۔ وہ ہر موجود سے ہر قوت سے مصلحت اندیش ہوکر، مرعوب ہوکر سمجھوتہ نہیں کرسکتا حضور اکرمؐ نے ساری انسانیت کو فکر اور عمل کی غلامی سے چاہے وہ کسی روپ میں ہو، نجات دلائی، اس لئے اقبال نے زور دیا ہے کہ ملت اسلامیہ کے افراد اپنی ذلت کو عزت، محکومی کو مختاری اور سر بزیری کو سر بلندی سے بدلنے کے لئے محمد مصطفی ﷺ سے اپنی وابستگی اور پیمان کو تازہ کریں۔

اگر سیرت طیبہ کے مطالعہ سے کوئی تحریک اپنے آپ کو بدلنے، اپنے ماحول کو بدلنے اور اس پر چھا جانے کی پیدا نہ ہو، اگر جذبات بیداری کی انگڑائی نہ لیں۔ عزم وہمت میں تازگی پیدا نہ ہو جمود کی برف نہ پگھلے، شرارِ آرزو پیدا نہ تو دامنِ محمدیؐ سے وابستگی کا ہمارا سارا دعویٰ عملاً بے اثر ہے۔

ہم دامانِ محمدیؐ سے وابستہ ہونے پر فخر کرتے ہیں۔ درود شریف کی محفلیں آراستہ کرتے ہیں۔ لیکن ایک مقام پر اقبال کہتے ہیں کہ جب میں رسول اکرمؐ پر درود بھیجتا ہوں تو میرا وجود شرم سے پانی پانی ہوجاتا ہے اور عشق کہتا ہے کہ تیرا وجود تو محکوم غیر ہے۔ ترا دل تو بت خانہ ہے۔ جس میں کئی بت براجمان ہیں اپنے دل میں تو نے کئی صنم آباد کر لئے ہیں۔ چاہے یہ بت ہوائے نفس کے ہوں۔ ذاتی شہرت اور منصب پرستی کے ہوں۔ اغیار سے مرعوبیت کے ہوں، خوف ودہشت کے ہوں، پیری وملائی کے ہوں، روایت پسندی اور آباء پرستی کے ہوں۔ جب تک تو ان بتوں کو پاش پاش کر کے اپنی زندگی کو پیغام محمدیؐ کے رنگ میں نہ رنگ دے اس وقت تک اس نام مبارک پر درود بھیجنے کا تجھے حق نہیں۔ اس لئے اقبال کا پیام یہی ہے۔

قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کردے
دہر میں اسم محمدؐ سے اجالا کردے

ملتِ اسلامیہ کے ایک فرد کی حیثیت سے مطالعہ اقبال کے ضمن میں میرے نزدیک تیسری

اہم بات یہ ہے کہ اقبال نے امت مسلمہ کو ایک نصب العینی امت کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ ان کے نزدیک ملت اسلامیہ کی بقاء اس لئے ضروری ہے کہ اس کے خمیر میں حریت و آزادی ہے۔ رنگ ونسل سے بیزارگی ہے اور ابھی اس کی خاکستر میں وہ چنگاری موجود ہے جو ایک شعلہ جوالہ بن کر خرمنِ باطل کو جلا سکتی ہے۔ انہوں نے اس سلسلہ میں ایک اعتراض کا جواب دیتے ہوئے کہا تھا کہ یہ درست ہے کہ مجھے اسلام سے بے حد محبت ہے لیکن محض اس محبت کی وجہ سے میں نے مسلمانوں کو اپنا مخاطب نہیں ٹھیرایا بلکہ اس لئے کہ تنہا یہی جماعت میرے مقاصد کے لئے موزوں واقع ہوئی ہے۔

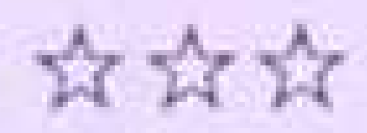
اس سلسلہ میں اس بات کو پیش نظر رکھنا چاہئے کہ ملت اسلامیہ سے اقبال کی محبت، ان کا اضطراب اور کرب، گروہی عصبیت کا نام نہیں۔ انہوں نے جتنی کڑی تنقید، غیر صحت مندر جحانات ، جمود پسندی اور روایت پرستی پر کی ہے شاید کسی اور نے کی ہو۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ ملت اسلامیہ کو نسبت ابراہیمی کی یاد دلاتے ہوئے ایک نئے جہاں کی تعمیر کے لئے آمادہ کرتے ہیں اور اس کے وجود کو عریانی عالم کے لئے پیرہن قرار دیتے ہیں۔

میری ہستی پیرہن عریانیِ عالم کی ہے
میرے لٹ جانے سے رسوائی بنی آدم کی ہے
بے خبر تو جوہر آئینہ ایام ہے
تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے

یہی وجہ ہے کہ اقبال نے نیند کے ماتوں کو اپنی بانگ درا سے جگایا۔ ان انسانوں کو جو سلطانی، ملائی اور پیری کا شکار ہو کر اپنی خودی کھو بیٹھے ہیں 'اپنے آپکو پہچاننے'' اپنی شخصیت کو مستحکم کرنے پر زور دیا۔ اس گروہ انسانیت سے وہ یہ توقع وابستہ کرتے ہیں کہ وہ اپنے موقف اور مقام کی بازیافت کر کے دوسری اقوام کے لئے ''شاہد' بن سکے گا۔ اقبال کی شاہکار نظم مسجد قرطبہ کو پڑھ جایئے جو شاعرانہ لطافتوں، تاریخی بصیرت، رجائیت اور فکر رسا کا حسین امتزاج ہے۔ اس نظم کے آخری دو بند خاص طور پر قابلِ غور ہیں۔ جس میں اقبال نے مغرب کے انقلابات پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے کہا ہے کہ ملت اسلامیہ کا موجود اضطراب ایک نئے انقلاب کا پیش خیمہ ہے۔

فکرِ اقبال کے جن تین پہلوؤں کا میں نے تذکرہ کیا ہے اس کی روشنی میں یہ واضح ہوگیا ہوگا کہ تعمیر ملت اقبال کے مطالعہ پر کیوں زور دیتی ہے۔ قرآن کی ابدی صداقتوں کو نئے انداز سے پیش کرتے ہوئے حضور اکرمؐ کی سیرت کو ''مقام و منزل ہر راہرو'' قرار دیتے ہوئے وہ اس ملت کو دعوت حرکت وعمل دیتے ہیں تاکہ وہ اپنے آپ کو صیقل کر کے دنیا کو وہ درس حیات افروز دے سکے جس کی بنیاد احترام آدمیت ہے۔ ان کی دعوت عمل اور پیام حرکت وحیات کی ترجمانی شاید یہ اشعار بہترین انداز میں کرتے ہیں۔

ہو صداقت کے لئے جس دل میں مرنے کی تڑپ
پہلے اپنے پیکر خاکی میں جاں پیدا کرے
پھونک ڈالے یہ زمین و آسمانِ مستعار
اور اس خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے



فکر اقبال کے چند امتیازی پہلو

(۹ جون ۱۹۷۳ء کو نوجوانوں کے اجتماع کی دوسری نشست میں کی گئی ایک تعارفی تقریر کی تلخیص)

دور جدید کی فکر اسلامی کی تشکیل میں اقبال کا خاص مقام ہے (میں نے پچھلی گفتگو میں یہ بات عرض کی تھی کہ) ان کی فکر بنیادی طور پر قرآنی ہدایت سے مستنیر رہی ہے ایک حساس دل اور نکتہ رس ذہن رکھنے والے کی حیثیت سے انہوں نے اپنے دور کے اضطراب اور کرب کا بغور جائزہ لیا۔ اور اپنے عصر کے تقاضوں کی روشنی میں انہوں نے نئے انداز سے اسلام کے چند پہلوؤں کو نمایاں طور پر پیش کیا ہے۔

اقبال کی فکر اسلامی کا پہلا اہم پہلو مقام انسان کی بازیافت ہے اور اسی کی روشنی میں ان کے پیام خودی وخود افروزی کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اقبالیات کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ اقبال کا شعری مجموعہ ''مثنوی اسرار خودی ہے'' یہ اس وقت شائع ہوئی جب کہ پہلی جنگ عظیم کی ہولناکیوں نے دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ اس وقت عام طور پر ساری انسانیت اور خاص طور پر ملت اسلامیہ کی کیفیات کو اقبال نے محسوس کیا اور ہر جگہ انہیں انسان کا انکار نظر آیا۔ انسانیت مجروح نظر آئی۔ مذہبی دنیا میں ایک طرف عیسائیت کا عقیدہ تھا جس نے اس دنیا کی زندگی کو آدم کے گناہ اولین کا نتیجہ قرار دے کر بنیادی طور پر شرف انسانیت کو مجروح کر دیا۔

بدھ مت نے ترک آرزو کی تعلیم دے کر قوائے عمل کو معطل کر دیا اور ہندو مت کے تصور کرما نے اس دنیا میں انسان کے ارادہ اور اختیار کو بے مقام بنا دیا۔ مذہبی فکر سے ہٹ کر دیگر نظریات نے بھی انسان کو انسان نہیں سمجھا۔ کہیں فرائیڈ کی نفسیاتی جبریت نے عہد طفولیت کے لاشعوری ارتسامات کو اس کے عمل کا متعین کرنے والا قرار دیا۔ کہیں وہ معاشی وجوب کے درمیان

ایک بے بس کھلونا بن گیا۔ کہیں اجتماعیت پسند سماجیات دانوں کے نزدیک وہ اپنے ماحول کا پروردہ خیال کیا گیا جہاں انسان کی انفرادیت بے اثر ہو کر رہ جاتی ہے۔ کہیں روحانی قدروں سے عاری ہو کر اس وسیع اور عریض کائنات میں انسان کی حیثیت ایک ذرۂ بے مقدار ہوگئی۔ غرض ہر جگہ انسان کو انسان ہی کی خود ساختہ زنجیروں اور تعینات نے محصور کر دیا۔ ان نظریات کے نتیجہ میں اور یورپ کے توسیع پسندانہ عزائم نے مشرق کے ممالک اور خصوصاً ملّت اسلامیہ کو بے بس اور مجبور کر دیا خود ملت اسلامیہ کے اندر انسان کی انفرادیت اور خودی جس طرح مجروح ہوگئی اس کی عکاسی کیلئے اقبال کا یہ شعر ہی کافی ہے۔

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری
اے کشتۂ سلطانی وملائی وپیری

اس پس منظر میں اقبال نے محسوس کیا کہ اپنی حقیقت سے بے خبر انسان کو خود بین وخودنگر بنانے کی ضرورت ہے تاکہ وہ اپنے اندر خدا کی ودیعت کردہ صلاحیتوں سے واقف ہوسکے۔ انہوں نے یہ پیام دیا۔ ''تو اپنی خودی کھو چکا ہے''۔ کھوئی ہوئی شئے کی جستجو کر۔ دیگر مذاہب کے مقابلہ میں اسلام نے خدا کے اقرار کے ساتھ انسان کا اقرار کیا ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے کہ انسان کو احسن تقویم پر پیدا کیا گیا ہے۔ اس کے قالب میں خدا تعالیٰ نے اپنی روح پھونکی اور فطرت الٰہی پر اس کی فطرت کی تشکیل ہوئی ہے۔ قرآن مجید کے اسی شرفِ انسانیت اور عظمتِ آدم کے پہلو کو اقبال نے بڑے شدومد کے ساتھ اپنی شاعری اور خطبات میں پیش کیا ہے۔ انہوں نے قرآن مجید کے قصہ آدم کی روشنی میں واضح کیا کہ انسان اس کائنات میں داغدار روح کے ساتھ نہیں پیدا کیا گیا اور نہ وہ کسی جبر کا اسیر ہے بلکہ وہ ارادہ اور اختیار کی امانت کے ساتھ مسجود ملائک ہے۔ گویا ساری کائنات میں وہ خدا کا نائب ہے اور اس کا فرض ہے کہ وہ اس پر حکمرانی کرے۔ اقبال نے ان سارے افکار پر کڑی تنقید کی ہے جس نے انسان کی عظمت اور اس کے مقام ومرتبہ کو گھٹا دیا۔ خود مسلمانوں کے اندر سرایت کرنے والے ایسے سارے رجحانات پر انہوں نے ضرب لگائی جس نے انسان کی خودی کو مجروح کر دیا۔ اسی بنیاد پر انہوں نے صوفی وملا کی بعض تاویلات کو اپنی تنقید کا نشانہ بنایا کہ ان کی جامد اور بے روح تعلیمات نے مسلمانوں کو بے عمل بنادیا اور ان

کی تاویلات نے دنیا بیزار گی، اور کشاکش حیات سے گریز پر آمادہ کیا۔ ملا کی ظاہر پرستیوں نے فروعات اور ظواہر کا اسیر کر دیا اور غیر صحت مند صوفیانہ افکار نے حرکت وحیات سے عاری کر دیا۔ اقبال نے کہا کہ ہر وہ رجحان انسان کے لئے سم قاتل ہے جو اس کی خودی کی نشوونما کو روک دے۔

یہ حکمتِ ملکوتی ، یہ علم لاہوتی : حرم کے درد کا درماں نہیں تو کچھ بھی نہیں
یہ ذکرِ نیم شبی ، یہ مراقبے یہ سرود : تری خودی کے نگہباں نہیں تو کچھ بھی نہیں

اقبال نے تقدیر کے بارے میں ان غلط تصورات کے خلاف آواز اٹھائی جو انسان کو بے عمل بنا دیتے ہیں۔ اس طرح تقدیر اور قسمت کے نام پر انسان کے قوائے عمل کو مفلوج کر دینا فطرت انسانی پر بڑا ظلم ہے۔

تیرے دریا میں طوفان کیوں نہیں ہے : خودی تیری مسلماں کیوں نہیں ہے
عبث ہے شکوۂ تقدیرِ یزداں : تو خود تقدیرِ یزداں کیوں نہیں ہے

غرض اقبال کے نزدیک خودی کا ادراک اس کی تربیت اور تکمیل ہی جدوجہد حیات کا مقصود اور خالق کائنات کا مطلوب ہے۔

خودی کی نشوونما محض ایک مراقبہ اور عزلت کا نام نہیں بلکہ وہ اجتماعیت کی زد پر پروان چڑھتی ہے۔ معاشرہ اور ماحول کے تصادم کے ذریعہ ابھرتی ہے۔ اس لئے اپنے ماحول اپنے معاشرہ کے ساتھ بے نیازی اور گریز اسلام کے اندر نہیں۔ اقبال کے نزدیک خودی اپنی ذات کا عرفان ہے۔ مراقبہ کے ساتھ مجاہدہ کا نام ہے اور ربط جماعت کے ساتھ ہی اس کی تکمیل ہو سکتی ہے۔

فرد را ربطِ جماعت رحمت است
جوہر اُو را کمال از ملت است

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے ایک قول کے مطابق سالک مقاماتِ سلوک طئے کرنے کے بعد (یعنی تزکیہ وتربیت کے بعد) مخلوق کی جانب مامور من اللہ ہو جاتا ہے۔

یہ بلیغ اشارہ ان کے نام لیواؤں کے لئے قابل غور ہے جنھوں نے خانقاہی نظام کی اصل عظمت اور اہمیت کو گھٹا دیا۔

اقبال کی فکر اسلامی کا ایک اور امتیازی پہلو ان کا تصور حرکت ہے۔ اس تصور حرکت کے

تین پہلو ہیں۔فرد، معاشرہ اور فطرت اقبال نے اپنے خطبات میں اس حقیقت پر زور دیا ہے کہ ملت اسلامیہ کے زوال کا اہم سبب یہ ہے کہ اس نے خدا کی زبردست آیت تغیر اور حرکت کو نظر انداز کر دیا ہے اور اس طرح ان کی حیات اجتماعی میں ٹھیراؤ اور جمود پیدا ہو گیا ہے۔ کارزارِ حیات میں بقاء کے لئے ضروری ہے کہ زندگی میں ثبات کے ساتھ تغیر اور حرکت کے اس پہلو کو نظر انداز نہ کیا جائے۔ اقبال کے نزدیک ملت اسلامیہ کے حیاتِ اجتماعی میں حرکت کا سبب جہاد اور اجتہاد ہے اجتہاد کا صرف فقہی اور تشریعی مفہوم نہیں ہے بلکہ یہ تغیر کے ساتھ ہم آہنگ ہونے کی صلاحیت، بدلتے ہوئے حالات میں معاشرتی حرکت کو جاری رکھنا ہے۔ اس طرح کا ایک پہلو جہاد بھی ہے جس کے معنیٰ صرف مقدس جنگ نہیں بلکہ تصادم اور پیکار کی اس دنیا میں اپنے آپ کو اثر انداز بنانا ہے۔ معاشرہ کے اندر انسان، انصاف اور مساوات جیسے بنیادی اصولوں کو برقرار رکھنا ہے اور ظلم اور استحصال کے مقابلہ کے لئے ذہنی اور مادی طور پر آمادہ رہنا ہے۔

یہ تصور حرکت و تغیر اس طرح اقبال کی فکر کا ایک خاص پہلو ہے دورِ جدید کے ترقیاتی اور علم و تحقیق کے میدان میں مسلمانوں کی پستی کے پس منظر میں اقبال کی فکر کا ایک اور امتیازی پہلو تسخیر فطرت پر زور دینا ہے۔ قرآن مجید کے نزدیک کائنات نہ تو مایا کا جال ہے اور نہ اس کا مطالعہ کوئی ناپسندیدہ بات ہے۔ اس کے برعکس قرآن مجید نے متعدد مقامات پر آفاق میں پھیلی ہوئی اللہ تعالیٰ کی نشانیوں پر غور و فکر کی تاکید ہے۔ مسلمان پچھلے پانچ سو سال سے قرآن مجید کے اس پہلو کو عملاً نظر انداز کرتے آئے ہیں۔ انہوں نے قصۂ آدم کی روشنی میں اس حقیقت کو واضح کیا کہ کائنات میں انسان کو نائب مقرر کرنے اور فطرت کی ساری قوتوں کو اس کے آگے سربسجود کروانے کا منشاء یہی ہے کہ انسان فطرت پر قابو پاتا ہوا خارج میں اپنی شخصیت کا اثبات کروائے۔ قرآن مجید کی رو سے یہ کائنات مسلسل حالتِ حرکت میں ہے۔ ''الآن کما کان'' کے ساتھ ''کل یوم ھو فی شان'' شان کی حقیقت جلوہ گر ہے۔

یہ کائنات ابھی نا تمام ہے شاید : کہ آرہی ہے دمادم صدائے کن فیکون
فریب نظر ہے سکون وثبات : تڑپتا ہے ہر ذرۂ کائنات
ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجود : کہ ہر لحظہ ہے تازہ شانِ وجود

انسان کی انفرادی حرکت اور ارتقاء کے لئے لامحدود امکانات یہ کہہ کر واضح کر دیئے گئے کہ خدا ہی تمہاری منزل ہے۔ یہ کبھی ختم نہ ہونے والا مسلسل سفر ہے۔

اجتماعی زندگی میں حرکت، مقاصد جلیل اور اعلیٰ نصب العین کی بدولت پیدا ہوتی ہے جس کو اقبال نے آرزو کا نام دیا ہے۔ سماجی حرکت کے لئے اقبال آرزو کی نشو ونما کے ساتھ ساتھ تصادم اور پیکار کو ضروری خیال کرتے ہیں۔ بانگ درا کی مشہور نظم ''ارتقاء'' کا یہی مرکزی خیال ہے۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز : چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی
کشاکشِ زم وگرما تپ وتراش وخراش : زخاکِ تیرہ دروں تابہ شیشۂ حلبی
اسی کشاکشِ پیہم سے زندہ ہیں اقوام : یہی ہے رازِ تب وتابِ ملتِ عربی

قرآن مجید نے فطرت کے بے شمار مظاہر کو خدا کی نشانیاں قرار دے کر ان پر غور و فکر کی دعوت دی ہے۔ ایک مقام پر اقبال نے روح ارضی کی زبانی اس حقیقت پر توجہ دلائی ہے۔

ممکنات کا امتحان قرار دیا ہے۔

ہیں تیرے تصرف میں یہ بادل یہ گھٹائیں : یہ گنبدِ افلاک یہ خاموش فضائیں
یہ کوہ، یہ صحرا، یہ سمندر، یہ ہوائیں : تھیں پیشِ نظر کل تو فرشتوں کی ادائیں
آئینہ ایام میں آج اپنی ادا دیکھ

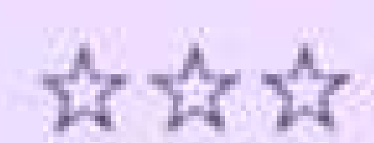
قرآن مجید میں ارشاد ہوا کہ دل کے ساتھ ساتھ انسان کو سمع اور بصر بھی عطا کئے گئے تاکہ انسان فطرت کا مشاہدہ کر سکے۔ ایک اور مقام پر ارباب دانش وحکمت کی یہ نشانی بتلائی گئی ہے کہ وہ اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے اور لیٹے ہوئے خدا کا ذکر کرتے ہیں اور تخلیق ارض وسماوات پر غور کرتے ہیں۔ اور ان کا یہ غور و فکر، انہیں اس نتیجہ پر پہنچاتا ہے کہ کائنات میں کوئی چیز بے کار نہیں پیدا کی گئی۔ گویا انسان کا کام ہے کہ غور و فکر تحقیق وجستجو کے ذریعہ کائنات کی ہر شئے کا علم حاصل کرے اور ان سے استفادہ کی راہیں نکالے۔ اس پس منظر میں اپنے خطبات میں اقبال نے ایک مقام پر کہا ہے کہ طبعی اعتبار سے عمل صالح کا مفہوم اس کے سوا کچھ نہیں کہ فطرت کے موالید اور عناصر کو مطیع کیا جائے اور انہیں زندگی کے اعلیٰ مقاصد کے لئے استعمال کیا جائے۔ باطن کے ساتھ آفاق کے مظاہر کے بارے میں انسان کا شعور جتنا بڑھتا جائے گا اتنا ہی وہ عرفان رب کی نئی

منزلوں سے ہم کنار ہوتا جائے گا۔

اقبال نے رموز بے خودی میں تسخیر فطرت کو ذاتِ مسلم کی توسیع کا سبب اور اس کے ممکنات کا امتحان قرار دیا ہے۔

کوہ و صحرا ، دشت و دریا ، بحر و بر : تختۂ تعلیمِ اربابِ نظر
اے کہ از تاثیرِ افیوں خفتۂ : عالمِ اسباب را دوں گفتۂ
خیز ، واکن دیدۂ مخمور را : دوں مخواں ایں عالم مجبور را
غایتش توسیعِ ذاتِ مسلم است : امتحانِ ممکنات مسلم است

مسلمانوں کے موجودہ زوال کے پس منظر میں تسخیر فطرت پر اقبال کا اصرار ان کی حکیمانہ نظر کا اظہار ہے۔ ان کے نزدیک یہ ایک زبردست تہذیبی اور تمدنی قوت ہے۔ اس اعتبار سے فطرت کے مظاہر کی تسخیر نہ صرف اعمال صالحہ کا ایک جز ہے بلکہ وراثت ارض کی ایک اہم شرط بھی ہے۔ اس طرح دور جدید میں اقبال کی فکرِ اسلامی کے یہ پہلو یعنی شرف انسانیت وعظمت آدم، انفرادی اور اجتماعی زندگی میں تغیر اور حرکت اور تسخیر فطرت امتیازی مقام رکھتے ہیں۔



عصری ہندوستان میں اقبال کی معنویت

(عالمی سمینار منعقدہ ۱۹۸۶ء میں پڑھا گیا)

عصری ہندوستان میں اقبال کی معنویت کے موضوع پر میں نے چند باتیں مسلم مسائل کے تناظر میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ مجھے احساس ہے کہ شاید اس بحث کے بعض پہلو نازک اور حساس ہو سکتے ہیں لیکن اب یہ موزوں موقع اور وقت ہے کہ ہم غیر جذباتی اور غیر جانبدارانہ اندازِ فکر اپناتے ہوئے مسائل کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ بد قسمتی سے فکرِ اقبال مختلف خانوں میں بٹ گئی۔ دانشوری کی اعلیٰ روایت اور تجزیہ و تنقیح کی معروضیت پر سیاست غالب آ گئی۔ اقبال جغرافیائی حدود میں محصور کر دیا گیا تو ہم نے ابتداء میں اعتذار کا لہجہ اپنایا۔ اب ہندوستان میں اقبال کی بازیافت کے لیے اس کی قومی شاعری اور حب وطن جیسے پہلوؤں پر زور دیا جانے لگا ہے ایسی بعض تحریروں سے احساس ہوتا ہے کہ کہیں ہم More Loyal than the king ثابت کرنے کی کوشش تو نہیں کر رہے ہیں۔ اس ردعمل سے مجھے انکار نہیں لیکن بات اور آگے بڑھنی چاہئے اور ان باتوں پر بحیثیت علمی اور معروضی اعتبار سے غور کرنا چاہئے جو اکثر ہماری الجھن کا باعث بنتی رہی ہیں۔

آج ایک نسل جس نے ۱۹۴۷ء کے ہنگاموں کے بعد آنکھیں کھولیں۔ شعور کی پختگی کو پہنچ چکی ہے۔ ان کے سامنے ہندوستانی مسلم سیاست میں اقبال کے رول کے بارے میں جو باتیں پیش کی جاتی رہیں وہ انہیں یہ سوچنے پر مجبور کرتی ہیں کہ کیا اقبال نے مسلمانوں کے ایک حصہ کے لیے علیحدہ علاقہ کی بات کر کے ان کے بارے میں صرف مسائل اور مشکلات نہیں چھوڑے۔ اقبال تقسیم ہند سے تقریباً ایک دہا قبل رخصت ہو گئے۔ اس کے بعد ہندوستانی سیاست کی کروٹوں اور اس کے الجھتے ہوئے پیچ و خم کی ذمہ داری کس حد تک اقبال پر عائد ہوتی ہے۔ یہ سوال آج بھی اہم ہے۔ راغب احسن اور تھامپسن کے نام خطوط کی حالیہ اشاعت کی وجہ سے مطالعہ کے نئے رخ

سامنے آئے ہیں بہر حال یہ باتیں اس موضوع سے غیر متعلق ہیں۔ لیکن اس تذکرہ کا مقصد یہ تھا کہ ہم ماضی کے اس بوجھ سے اپنے ذہن کو آزاد کریں اور ایک بلندی سے سارے منظر کو دیکھیں تو شاید اقبال کے افکار کے وہ بنیادی پہلو ابھر کر آئیں جو سیاسی دھندلکوں میں چھپ سے گئے تھے۔

شاید اسی بات کو یوں کہا جا سکتا ہے کہ خود عصریت کے اندر تغیر اور تبدل کا پہلو ہے اور معنویت کسی نظریہ کی عملی قدر و قیمت کو متعین کرتی ہے اس لیے یہ سوال اہم ہے کہ فکرِ اقبال کے وہ کونسے پہلو ہیں جو بنیادی کہے جا سکتے ہیں اور وہ کون سے پہلو جن کی نوعیت ثانوی یا Peripheral ہے۔ اس لئے بنیادی منہاج فکر اور دیئے گئے حالات میں طریقہ کار کے مابین فرق کو ملحوظ رہنا چاہیے۔ ہاں یہ بھی ضروری نہیں کہ اقبال کی ہر بات کو من وعن قبول کر لیا جائے۔ نطشے نے کہا تھا۔

We are most dishounourable towards God, He is not permitted to sin میں کل اقبال کا پرستار ہوں لیکن یہ بھی نہیں چاہتا کہ ہم اقبال کو اتنا تقدس مآب بنا دیں کہ انہیں معصوم عن الخطا سمجھ لیں۔ اس کے برعکس یہ رویہ بھی مستحسن نہیں ہے کہ فکر کے کسی جز و کو کل پر طاری کر کے اس کی من مانی تاویل کریں۔

اس پس منظر میں عصری ہندوستان میں مسلمانوں کے لئے اقبال کی معنویت پر غور کرنے سے قبل اس مسلم وحدت کے موقف کا جائزہ لیں تو چند اہم پہلو سامنے آتے ہیں۔

(ا) بہ حیثیت امت کے ایک اہم جز و اس کا خصوصی موقف اور انفرادیت اور اس سے متعلق ذمہ داریاں

(ب) وہ مسائل جو عصری ہندوستان کے چوکھٹے میں درپیش ہیں۔ یہاں ان مسائل کی نوعیت بھی دو طرح کی ہوگی ایک جو وسیع تر ہندوستان اور اس کے مخلوط معاشرہ میں باہمی اشتراک اور تعاون کے ذریعہ حل کئے جا سکتے ہیں دوسرے وہ مسائل جنہیں صرف ملی سطح پر طئے کرنا ہوگا۔

حالات نے ہندوستانی مسلمانوں کو اس مقام پر لا کھڑا کیا ہے۔ جو خود تاریخ اسلام میں منفرد ہے۔ عددی اعتبار سے اس کا موقف منفرد ہے اور اس کے تہذیبی اور معاشرتی مسائل اوروں سے جداگانہ ہیں۔ اس صورتِ حال میں اس مسلم وحدت کو اپنی ندرتِ فکر سے اپنی بقاء اور

استحکام کے ذریعہ اپنا تاریخی رول انجام دینا ہے۔

جہاں تک امت کے جز ہونے کی حیثیت سے ہندوستانی مسلم وحدت کا سوال ہے۔شاید عالم اسلام کے لیے مسلم ہند سیاسی اعتبار سے غیر اہم ہو۔لیکن دور جدید میں دیگر مسلم ممالک کے مقابلہ میں دور جدید میں اسلام کی تعبیر اور ترجمانی کے سلسلہ میں جو انفرادیت ہندوستانی مسلم وحدت کو حاصل ہے وہ کئی اعتبارات سے بڑی اہم ہے۔مسلم ممالک میں مختلف سیاسی حالات ، مختلف سیاسی اداروں کی مذہبی بنیاد پر تعبیر اور تاویل اور ان کے اثرات جیسے مسائل یہاں نہیں ہیں ۔ایک اور اہم بات یہ ہے کہ ان ممالک میں جہاں اسلام کی بات آتی ہے وہاں اس کے تشریعی پہلو اور اس کے نفاذ کی طرف جھکاؤ زیادہ ہوتا ہے لیکن جہاں تک اسلام کی نکھری اور نتھرائی ہوئی روح کے انکشاف کے امکانات کا سوال ہے شاید مسلم ہند بہتر خدمت کر سکتا ہے۔

اس اعتبار سے اپنی افکار کی تشکیلِ جدید کے سلسلہ میں اقبال کی معنویت بیحد اہم ہے کہ شاہ ولی اللہؒ کے بعد اقبال وہ مفکر ہیں جنہوں نے مختلف اقطاب (Polarities) کے درمیان تطبیق کی راہ دکھائی یہ تطبیقی جامعیت پسندی ہمیں خطبات میں نظر آتی ہے جہاں وہ مختلف عصری نظریات کا تجزیہ کرتے ہوئے اسلامی حکمت کا جامع تصور پیش کرتے ہیں۔عقل و وجدان ، انفس و آفاق ، ثبات و تغیر ، تخلیق و تحفظ ، تقلید و اجتہاد ، خیر و شر ، جبر و قدر ، روحانیت اور مادیت جیسے کئی اقطاب کے درمیان جو امتزاج اور توازن ہے اس پر بہت کم توجہ دی گئی ہے۔شاید یہاں اتنا ہی اشارہ کافی ہوگا۔تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔حیرت کی بات یہ ہے کہ علمائے کرام نے خطبات میں اٹھائے ہوئے نکات پر بہت کم توجہ دی۔کم از کم اس معیار کی کوئی تنقید ہی ہوتی تو کچھ بات بنتی۔ خطباتِ اقبال کا ایک مقصد اس سائنسی اور تجرباتی دور میں حکمتِ قرآنی کا اثبات ہے۔ان کے زمانہ کا جو ذہنی افق تھا آج مغرب اس سے کہیں آگے نکل گیا۔لیکن مسلم فکر ابھی اقبال تک نہیں پہنچ سکی۔

ان مسائل کی نوعیت صرف نظریاتی نہیں بلکہ انطباقی بھی ہے اس جانب میں عملی اقدامات کے لئے بعض واضح اشارات بھی اقبال کے ہاں مل جاتے ہیں۔یہاں میں صرف ایک مثال دینے پر اکتفا کروں گا۔علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں اسلامیات کے نصاب کے سلسلہ میں انہوں نے لکھا

تھا کہ'' آج جدید زندگی یکسر متغیر ہے اور جس قسم کا علمی منہاج عہد متوسط کے مسلمانوں کی تسکین قلب کے لیے کافی تھا وہ آج کافی نہیں۔ اجتہادی گہرائیوں کو حاصل کرنا ہوتو فکر دینی کی از سرنو تعمیر ضروری ہے۔'' چنانچہ انہیں اس ضرورت کا احساس تھا کہ موزوں صفات کے ایسے علماء تیار کئے جائیں جو ملت کی روحانی ضرورتوں کو پورا کرسکیں۔ اس ضمن میں ان کی ایک تجویز یہ تھی کہ ''دیوبند اور لکھنو کے وہ علماء جو خالص سائنٹیفک تحقیقات کا خصوصی ذوق رکھتے ہوں ان کو ان کے میلانات طبعی کے اعتبار سے جدید علوم کی تعلیم دی جائے۔'' یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ خود ہندوستان میں مسلم فکر کے کئی دھارے بنیادی طور پر اقبال سے متاثر ہورہے ہیں۔ انہوں نے اپنی نظریاتی بنیاد اقبال کے افکار ہی میں تلاش کی۔ لیکن کل اقبال کا احاطہ نہ ہوسکا۔ کہیں جھکاؤ اسلام کے Socio-polictical اظہار کی طرف رہا تو کہیں اس کی کسی جزوی تعبیر پر کہیں دنیا کی کشمکش سے فرار کا رجحان کارفرما نظر آتا ہے یہ صورتِ حال اسی تطبیقی منہاج فکر اور نازک توازن کا احساس دلاتی ہے جس کے روشن امکانات ہمیں اقبال کے ہاں نظر آتے ہیں اور جو انہیں کسی اور مسلم مفکر کے مقابلہ میں بامعنی بناتی ہیں۔

مسائل کے دوسرے پہلو کا ایک جزوہ ہے جنہیں ہمیں وسیع تر ہندوستان کے چوکھٹے میں غور کرنا ہے۔ اسلامی شناخت اور ہندوستانی شناخت اور ان کے مابین تقاضوں کے مسائل نئے نہیں ہیں۔ ان پر بہت کچھ کہا اور لکھا جاچکا ہے۔ لیکن آج ان کی نوعیت بدل گئی ہے ان پہلوؤں کے درمیان نازک توازن اور تطابق بظاہر بڑا دشوار نظر آتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں بعض شارحین اقبال کو اقبال کی اسلامیت اور آفاقیت میں تضاد نظر آتا ہے یا ان دو پہلوؤں کو جدا سمجھا جاتا ہے۔ اقبال نے متعدد مقامات پر اپنے اس نقطۂ نظر کو واضح کیا ہے کہ'' اگر عالمِ بشریت کا مقصد اقوامِ انسانی کا امن، سلامتی اور ان کی موجودہ ہیئتوں کو بدل کر ایک واحد اجتماعی نظم بنانا قرار دیا جائے تو سوائے اسلام کے کوئی اور اجتماعی نظم ذہن میں نہیں آسکتا کیوں کہ قرآن کی رو سے اسلام محض انسان کی اخلاقی اصلاح ہی کا داعی نہیں بلکہ عالمِ بشریت کی اجتماعی زندگی میں ایک تدریجی مگر اساسی انقلاب بھی چاہتا ہے جو اس کے قومی اور نسلی نقطۂ نگاہ کو یکسر بدل کر اس میں خالص انسانی ضمیر کی تخلیق کرے'' اس کے لئے کائنات کی روحانی تعبیر، انسانی فرد کی آزادی اور

وہ بنیادی اصول جو اقوام کے اخلاقی اور روحانی ارتقاء کے لئے سنگ میل کا کام دے سکیں' بنیادی عوامل میں یہ اقبال کی فکر کا بنیادی محور ہے اور اس تدریجی اور اساسی انقلاب کے عمل میں مسلمانوں کی حیثیت تبدیلی کے عامل یعنی Agent of change کی ہے۔ اس طرح اسلام اور اس کی آفاقیت اور مسلمانوں کے اصولی موقف کے بارے میں اقبال کا نقطۂ نظر واضح ہے (یہ بحث بالکل جداگانہ ہے کہ آیا عالم بشری میں اس تدریجی انقلاب کا عمل جاری ہے یا رک گیا ہے اور اگر ایسا ہے تو اس کے تاریخی اسباب کیا ہیں؟

بہتر سماج کی تشکیل کی سمت، تبدیلی کے ایک قومی عامل کی حیثیت سے ہندوستانی مسلمان ان سارے تعمیری رجحانات کے امین بن سکتے ہیں جو اس ملک کی تقدیر کے صورت گر ہیں۔ سائنس اور ٹکنالوجی صنعتی انقلاب اور سوسائٹی پر ان کے اثرات کے علی الرغم حقیقی روحانی اور اخلاقی قدروں کی پاسبانی آج اس مسلم وحدت کا بنیادی منصب ہے جو اس کی بقا اور ترقی کا بھی ضامن ہے۔ آج عصری ہندوستان میں مختلف لسانی اور علاقائی وحدتوں کا اختلاف جارحیت میں بدلتا جارہا ہے۔ اس اعتبار سے مسلمان تہذیبی اور اخلاقی سطح پر ایک رابطہ کی حیثیت سے خود ملک کی سالمیت کو برقرار رکھنے میں اہم خدمت انجام دے سکتے ہیں۔

جدید ہندوستان کا ایک المیہ یہ ہے کہ روحانی اور اخلاقی اصولوں کے اشتراک کا عمل نہ صرف رک گیا ہے بلکہ مختلف وحدتوں کے درمیان خلیج وسیع ہوتی جارہی ہے۔ اس پس منظر میں اقبال کے مذہبی اور تہذیبی شعور کی معنویت تلاش کرنی ہو تو ان مقامات پر غور کرنا ضروری ہے۔ جہاں دوریاں، قربت میں بدل سکتی ہیں اور جہاں اشتراک کے امکانات موجود ہیں۔ میں یہاں جاوید نامہ سے صرف ایک مثال پیش کرنا چاہوں گا جس کا آغاز مناجات سے ہوتا ہے۔ جہاں اقبال ''آنیم من جاودانی کن مرا'' کی دعا کرتے ہیں۔ ابتداء ہی میں فلکِ قمر پر عارف ہندی (وشوامتر) سے ملاقات ہوتی ہے۔ یہاں رومی اور عارفِ ہندی کے مکالمات توجہ کے طالب ہیں۔ اس مکالمہ کے بارے میں اپنے ایک لکچر میں پروفیسر عالم خوندمیری نے بڑی معنی خیز بات کی تھی کہ یہاں اقبال نے ایک بالکل نئے Motive کا اضافہ کیا جس کو آج کل کی زبان میں Dialogue کہا جاتا ہے۔ اقبال نے اس بات کو پوری طرح محسوس کیا کہ نئے انسان کا مستقبل

مکالمہ پر منحصر ہے۔ یہ مکالمہ انہیں افراد کے درمیان ہوگا جو ظاہر سے باطن کی طرف اور آفاق سے انفس کی طرف سفر کی آرزو رکھتے ہیں۔ اس اعتبار سے یہ مکالمہ دو تہذیبوں کا مکالمہ ہے۔ اس ضمن میں عابد حسین نے ٹیگور اور اقبال کا تذکرہ کرتے ہوئے بڑی اچھی بات کہی تھی کہ ''دونوں نے اپنے وجدانِ صحیح کی مدد سے اپنی اپنی تہذیب کی حقیقی روح کو پالیا اور اپنی حرارت قلب سے افسردگی اور جمود کو دور کر کے تازگی اور گرمی پیدا کر دی۔ ہمارے لیے بہترین تدبیر یہ ہے کہ تہذیبی جائزہ کی کٹھن منزل میں جہاں ایسے مقام آجائیں کہ راستہ نہ سوجھتا ہو وہاں اقبال اور ٹیگور کو دلیلِ راہ بنائیں۔''

باہمی روابط اور اشتراک کا یہ عمل تلخ حالات کی نذر ہو گیا ہے اور ہندوستان میں مسلم وحدت کے اپنی شناخت پر اصرار کو ملک کے دھارے کے خلاف سمجھنے کا رجحان بڑھتا جا رہا ہے۔ اس رویہ کے اثرات فطری طور پر اندیشہ مندی اور عدم تحفظ کے رجحانات کو جنم دیتے ہیں۔ دوسرے انداز میں یہ بات یوں بھی پیش کی جاسکتی ہے کہ اگر غیر منقسم ہندوستان میں اقبال کے سامنے ایک اہم مسئلہ مذہبی اور تہذیبی اعتبار سے مسلم شناخت کا تھا تو کیا بدلے ہوئے حالات میں بہ اندازِ دگر یہ مسئلہ موجود نہیں ہے۔ یہاں فکر اقبال کے وہ مقامات ہمارے لیے بامعنیٰ بن جاتے ہیں جہاں افراد اور سماج سے برتاؤ میں محبت اور نرمی کے ساتھ خودارادیت اور تحفظ کا پہلو سامنے آتا ہے۔ اسی لئے وہ اس اکائی کی تہذیبی اور ملی روایات کے استحکام پر بھی زور دیتے ہیں۔ وہ ہر ایسے معاملہ میں بڑے حساس ہیں جو اس شناخت میں رخنہ ڈالے۔ ان کا کہنا ہے کہ اس قسم کے معاملات میں جو لوگ رواداری کا نام لیتے ہیں وہ رواداری کے استعمال میں غیر محتاط ہیں۔ ایک رواداری کمزور کی ہوتی ہے جو محض کمزوری کی وجہ سے ہر قسم کی ذلت کو برداشت کر لیتا ہے ایک رواداری ایسے شخص کی ہوتی ہے جو روحانی حیثیت سے قوی ہوتا ہے اور اپنے مذہب کی سرحدوں کی حفاظت کرتے ہوئے دوسرے مذاہب کو روا رکھتا ہے اور ان کی قدر کر سکتا ہے۔''

اکثریت کے درمیان، اقلیت کو اپنے معنوی اور مادی وجود کی برقراری کے لیے جس Tension اور کشمکش سے دوچار ہونا پڑتا ہے وہ ایک فطری امر ہے اسی لئے اقبال اخلاقی اعتبار سے اس لذتِ پیکار کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ عصری ہندوستان میں اس تہذیبی وحدت کے لیے

اقبال کا یہ پیام بھی بڑی معنویت رکھتا ہے ''اگر خواہی حیات اندر خطر زی''

عصری ہندوستان میں مسلم مسائل پر گفتگو کرتے ہوئے جمہوریت، سوشلزم اور سیکولرزم کی بحث بھی آجاتی ہے۔ موجودہ حالات میں یہ رُجحانات سماج میں کس حد تک فروغ پا سکے ہیں۔ یہ علیحدہ بحث ہے لیکن ملک کے لئے Commitments روشن اور مثبت پہلو ہیں۔ بدقسمتی سے اقبال کو جمہوریت، سوشلزم اور سیکولرزم کا مخالف بنا کر پیش کیا جاتا رہا ہے۔ کسی ملک کے مخصوص معاشرتی اور معاشی تقاضوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان اصطلاحات کی تعبیریں ایک سے زیادہ ممکن ہیں۔ اقبال نے جمہوریت کے سیاسی تصور پر ضرور شدید تنقید کی جو جمہوری لباس میں شاہی اور چنگزیت کا دوسرا روپ تھی لیکن اگر جمہوریت کی بنیاد فرد کی رائے کا احترام و آزادی اور ایک مثبت فکری معاشرتی اور سیاسی نظام کی تشکیل میں ایک فیصلہ کن عنصر کی حیثیت ہو تو اس کا علمبردار اقبال سے بڑھ کر اور کون ہوسکتا ہے اسی طرح سرمایہ اور محنت کی کشمکش میں اقبال کا موقف اور معاشی استحصال اور ظلم کے خلاف ان کے افکار واضح ہیں۔

غرض کئی ایسے مسائل جو اقبال کی زندگی میں ابھر کر آئے تھے آج پس منظر میں چلے گئے لیکن انسانی تقدیر اور ایک نئے نظامِ معاشرتی کی تشکیل کے لیے اقبال کے پاس جو تڑپ ملتی ہے وہ ساری تہذیب انسانی کا اثاثہ ہے۔ اس نقطۂ نظر سے عصری ہندوستان میں اقبال کی معنویت کا جائزہ لیا جانا چاہئے۔ اور بدلے ہوئے حالات میں مطالعہ کی نئی جہتیں متعین کرنی ہوں گی۔

جناب مصلح الدین سعدی نے اپنے ایک مضمون میں اقبال کی مشہور نظم ''شعاع امید'' کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ ''تمثیل ہندوستانی مسلمانوں پر صادق آسکتی ہے اور اس شعاعِ امید کی معنوی تجسم اور تشکیل کے امکانات بڑے معنی خیز ہیں جو اپنے سرچشمہ سے کسب فیض کرتی ہوئے خاکِ ہند کے ہر ذرہ کو جہاں تاب بنانے کا عزم رکھتی ہے۔''

شاید یہ کہنا بے جانہ ہوگا کہ عصری ہندوستان میں اقبال ہمارے لئے زینت نہیں بلکہ ایک ضرورت ہیں۔ اس کے لیے ہمیں اس منزل کو جہاں دوسروں کا ذہنی سفر ختم ہوتا ہے اپنے سفر کا نقطۂ آغاز بنانا ہوگا۔

☆☆☆

مسلم طلباء وطالبات کی شخصیت سازی
(تعلیمات اقبآل کی روشنی میں)

جناب رشید انجینئر کا حکم ہے کہ چند سطور دئے گئے عنوان پر تحریر کروں۔ موصوف نے اپنی عمر عزیز کو مسلم نوجوانوں کی تعلیم کے وقف کر دیا ہے۔ وہ ایک بے لوث، خاموش، شہرت و نام ونمود سے بے نیاز شخص ہیں ان کی شخصیت اور خدمات قابل رشک ہیں، اس لیے میرے لئے انکار کا مرحلہ سخت دشوار ہے۔ نہ تو میں مسلمانوں کی تعلیم وتربیت کے سلسلہ میں کوئی عملی تجربہ رکھتا ہوں نہ ماہر تعلیم ہوں۔ کیوں کہ خوش قسمتی یا بد قسمتی سے میری پہچان، اقبال اکیڈمی کے حوالے سے ایک ''اقبالی مجرم'' کی بن گئی ہے اس لیے شاید انہوں نے مجھے اس موضوع پر لکھنے کے لیے فرمایا ہے۔

اقبال روایتی معنی میں ماہر تعلیم نہیں تھے۔ ہاں انہوں نے ایک دردمند دل رکھنے والے صاحب نظر کی حیثیت سے مسلم نوجوانوں، خصوصاً طلباء وطالبات کی تعلیم وتربیت پر نظم اور نثر میں بہت کچھ لکھا ہے۔ چنانچہ ''بچوں کی تعلیم وتربیت'' کے موضوع پر جنوری ۱۹۰۲ء میں ہی ایک مضمون لکھا تھا جو ''مخزن'' میں شائع ہوا تھا، اس مضمون میں بچوں کی ذہنی اور اخلاقی نشوونما کے نفسیاتی پہلوؤں کا اقبال نے جائزہ لیا تھا۔

اس سوال کے پیچھے کہ شخصیت سازی کے لیے اقبالیات سے کس طرح استفادہ کیا جاسکتا ہے؟ یہ تمنا پوشیدہ ہے کہ موجودہ دور کے اخلاقی انحطاط وشخصیت کے انتشار کے تناظر میں عصری درس گاہوں میں تعلیم پانے والے طالب علموں کے کردار کی تشکیل اور شخصیت سازی کے کیا امکانات ہیں اور ان کی عملی صورت گری کے کیا امکانات ہو سکتے ہیں۔ اس سوال کا جواب خود کئی سوالات کو جنم دیتا ہے۔ جو نہ صرف نظریاتی بلکہ عملی سطح پر ارباب علم ودانش کے غور وفکر کے محتاج ہیں۔ یہاں صرف اقبالیات کے حوالے سے شخصیت سازی اور اعلیٰ اخلاقی صفات کی نشوونما کے لیے فکر اقبال سے راہیں متعین کرنا ہے۔ گہرے علمی مسائل اور فلسفیانہ تجزیوں کے بغیر سیدھے سادے انداز میں اقبال کے خیالات کو پیش کرنا ہے۔

ابتدا میں اس حقیقت کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ ہماری عصری درس گاہوں کے نصاب میں مذہبی اور اخلاقی تعلیم کا پہلو شامل نہیں ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ مقامی انتظامیہ اس سلسلہ میں ضروری اقدامات کے لیے آزاد ہے۔ ظاہر ہے کہ میں تکثیری سماج میں کسی گروہ کی مذہبی اور تہذیبی شناخت کا مسئلہ اہم ہو جاتا ہے لیکن یہ واضح رہے کہ ایسا کوئی تشخص isolation پورے معاشرے سے کٹ کر نہ تو ممکن ہے نہ مستحسن۔ اگر ملک کے کسی گروہ کے لیے ایسے اقدامات جو نوجوانوں کی شخصیت و کردار کو سنوارنے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں تو بلا لحاظ مذہب وملت پورے ملک اور معاشرہ کا بھلا ہوگا۔ اقبال نے اپنے مذکورہ بالا مضمون ''بچوں کی تعلیم وتربیت'' میں اس جانب اشارہ ان الفاظ میں کیا تھا کہ صدہا انسان ایسے ہیں جو دنیا میں زندگی تو بسر کرتے ہیں مگر اپنے اخلاقی تعلقات سے محض جاہل ہوتے ہیں، ان کی زندگی جانوروں کی طرح ہے کیوں کہ ان کا ہر فعل خودغرضی اور بے جا خودداری کے اصولوں پر مبنی ہوتا ہے اور وہ اس مبارک تعلق سے غافل ہوتے ہیں جو بہ حیثیت انسان ہونے کے ان کو باقی افراد بنی نوع (یعنی انسانیت) سے ہو۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ مسلم طلباء اور طالبات کی شخصیت سازی اور کردار کی تشکیل محض ایک ملی مسئلہ نہیں بلکہ پوری انسانیت کی فلاح کا پہلو بھی اس میں شامل ہے۔

اب آگے بڑھنے سے پہلے شاید مناسب ہوگا کہ ہم شخصیت کی کوئی آسان اور قابل فہم تعریف متعین کرلیں۔

ہر انسانی شخصیت ظاہری اور روحانی اعتبار سے منفرد ہوتی ہے یعنی وہ دوسرے سے جدا اور ممتاز ہوتی ہے۔ دوسرے معنی میں شخصیت انفرادیت کا نام ہے۔ شخصیت سازی کا پہلا مرحلہ یہ ہے کہ انسان اپنے وجود کی اہمیت اور مقام کو سمجھے، اپنی ذات اور اس کی عظمت کو پہچانے کہ خالق کائنات نے اسے بہترین صلاحیتوں کے ساتھ پیدا فرمایا ہے۔ اس کے اندر بے پناہ استعداد اور قابلیت رکھ دی گئی ہے۔ اب ان صلاحیتوں کی پہچان اور ان کو ترقی دینا انسان کا اخلاقی اور مذہبی فریضہ ہے۔ اگر وہ اپنی شخصیت کی نشوونما نہیں کرتا تو وہ اپنے وجود کے منشاء کی تکمیل نہیں کرتا۔ دنیا کی ہر چیز اپنا اظہار چاہتی ہے۔ ایک بیج کے اندر ایک تناور درخت کا روپ دھارنے کی صلاحیت پوشیدہ ہوتی ہے۔

ظلمت کدۂ خاک پہ شاکر نہیں رہتا
ہر لحظہ ہے دانے کو جنوں نشوونما کا

اقبال کے تصور خودی کا مفہوم، ٹھیٹ علمی اور فلسفیانہ مباحث میں گئے بغیر ''شخصیت'' ہی ہے انہوں نے فرد کے تشخص اور پختگی کو (صدف) سیپی اور گہر (موتی) کے استعاروں سے سمجھایا ہے۔ یعنی پانی کے ایک قطرہ یعنی آب نیساں کو موتی بننے کے لئے صدف کی ضرورت ہوتی ہے۔ انسانی شخصیت کے لئے یہ صدف اس کا ماحول یا معاشرہ ہے جس کے بغیر اس کا ارتقاء ناممکن ہے۔ صدف میں گہر کا جوہر نہیں ہوتا لیکن اسکی آغوش قطرۂ نیساں کو گہر بنا دیتی ہے۔

آغوشِ صدف جس کے نصیبوں میں نہیں ہے
وہ قطرۂ نیساں کبھی بنتا نہیں گوہر

یہاں شخصیت کی نشوونما اور اس کی صلاحیتوں کی نشوونما کے لئے فکرِ اقبال کا ایک اور اہم پہلو اجاگر ہوتا ہے کہ جس طرح موتی اپنی آب وتاب کے لئے صدف کا محتاج ہے، اسی طرح شخصیت کی تربیت معاشرہ کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ جس طرح ایک بیج کی نشوونما کے لئے ضروری ہے کہ اسے زمین میں بو دیا جائے اور اس کے سامان حیات میں ایک طرح کا توازن ہو۔ اگر اس کو زندگی بخشنے والے عناصر میں کمی یا زیادتی ہو جائے تو بیج کے نمو پانے کے امکانات باقی نہیں رہتے۔ اسی طرح فرد کے کمالات اور اس کی استعداد کی ترقی کے لئے ایک نظمِ اجتماعی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اقبال کی اصطلاح میں یہی بیخودی ہے۔

اقبال کے اس ابتدائی پس منظر کی روشنی میں شخصیت سازی کے اقبال کے تصورات کا ایک خاکہ آسانی سے مرتب کیا جا سکتا ہے یہاں چند اہم باتوں کا اشارہ کافی ہے۔

ا۔ پہلی بنیادی بات شخصیت کے عرفان اور اس کی تشکیل کے لئے مستحکم ایمان اور یقین لازمی ہے۔ انسانی شخصیت کی انفرادی اور اجتماعی صلاحیتوں کو پروان چڑھانے کے لیے اس حقیقت کو پیش نظر رکھنا چاہئے کہ خالق کائنات نے اسے کائنات میں اعلیٰ ترین تعلیم عطا کر کے اسے اپنی صفات کے پرتو سے سرفراز فرمایا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کا مختلف مدارج کے لحاظ سے انسان میں ظہور ہوا ہے۔ اب شخصیت سازی کے لئے انسان کا فریضہ ہے کہ ان عطا کی گئی صفات کے رنگ کو اپنی شخصیت اور کردار میں گہرا کرے، جتنا یہ رنگ گہرا ہوگا اتنا ہی اس کی شخصیت مستحکم ہوگی۔ تعلیم وتربیت کے سلسلہ میں بھی اقبال کا کہنا ہے۔

جو ہر میں ہے ''لاالہ'' تو کیا خوف
تعلیم ہو گر فرنگیانہ

اگر موجودہ ماحول ، اس کے عقیدہ اور تہذیبی قدروں کے موافق نہیں ہے لیکن اگر اس کے دل ودماغ میں ''لاالہ'' راسخ ہو تو نہ صرف مخالف ماحول پر غالب آسکتا ہے، اس کی انتشاری قوتوں سے محفوظ رہ سکتا ہے بلکہ اپنی شخصیت کو مستحکم کرتے ہوئے معاشرہ پر اثر انداز ہو سکتا ہے۔ گویا توحید کا اقرار شرف انسانیت کا اقرار ہے۔

زندہ قوت تھی جہاں میں یہی توحید کبھی
آج کیا ہے فقط اک مسئلہ علم کلام
روشن اس ضو سے اگر ظلمت کردار نہ ہو
خود مسلماں سے ہے پوشیدہ مسلماں کا مقام

شخصیت کے نکھار شادابی وخلاقی کے لئے ایک اور اہم بنیاد محبت بلکہ شدت محبت ہے۔ اس کے لئے محبوب کو دل میں بسانا ضروری ہے۔ اس طرح کہ یہ محبت، محبوب کی ہر ادا پر عمل اور اتباع کا محور ومرکز بن جائے۔ یہ محبوب کوئی اور نہیں ہے بلکہ ختمی مرتبت حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی ذات گرامی ہے جو ''مقام منزلِ ہر راہرو'' ہے اسی محبت میں شخصیت کے ممکنات کا ظہور پوشیدہ ہے۔ تفصیل کا موقع نہیں ہے اگر رحمۃ للعالمین ﷺ کی ذات طیبہ کا مطالعہ اس نقطۂ نظر سے کیا جائے کہ آپؐ نے افراد کی صلاحیتوں کو کس طرح پرکھا، ان کی کس طرح ہمت افزائی فرمائی۔ ان کی سیرت وکردار کی تشکیل فرمائی کہ ۲۳ سال کے عرصہ میں ساری دنیا کی کایا پلٹ گئی۔ دنیا میں ایک انقلاب مسلسل کی بنیاد رکھ دی گئی تو ہماری بصیرت کے لیے کئی پہلو نمایاں ہوتے ہیں۔ یہاں تربیتِ نبویؐ کے سماجی نفسیاتی عوامل ہمارے سامنے ابھر کر آتے ہیں۔ اس معاشرہ میں مختلف کردار نظر آتے جو زندگی کے مختلف شعبوں میں مثالی بن گئے۔ ع ذرۂ ریگ کو دیا تو نے فروغ آفتاب۔

اقبال کہتے ہیں مسلمان کی سرشت ایک موتی کے مانند ہے جس کی آب وتاب ''یم پیغمبرؐ'' کی آغوش میں ہوتی ہے۔ ہمارے قائدین، علمائے کرام، واعظین عظام کے سامنے یہ حقیقت پیش نظر رہنی چاہئے

کہ محبتِ رسولؐ کے کھوکھلے دعوے یا زبانی اظہار کافی نہیں ہے بلکہ اس کا اظہار ہماری عملی زندگی میں اس طرح ہونا چاہئے کہ لوگوں کے دلوں میں محبت کی یہ چنگاری روشن کر کے اعلیٰ کردار واخلاق کے نمونے پیش کئے جاسکیں۔ وعظ اور تلقین سے زیادہ اعلیٰ سیرت اور شخصیت کے نمونے زیادہ اثر انداز ہوتے ہیں۔ معاشرہ میں سچ سے زیادہ سچے کا وزن ہوتا ہے۔ قرآن کریم میں نبی کریم ﷺ کی حیات طیبہ کو مخالفوں اور انکار کرنے والوں کے سامنے یوں پیش کیا گیا ہے ''میں نے اس سے قبل تمہارے ہی درمیان ایک عمر گزاری ہے۔ کیا تم عقل نہیں رکھتے؟''

یہ تو رہی شخصیت سازی کی حقیقی بنیاد ہے۔ جس کے بغیر ایک عصری درس گاہ سے فارغ ہونے والا طالب علم اپنے فن میں ماہر تو بن سکتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ وہ ایک اعلیٰ کردار کا حامل بن سکے۔ یہاں عملی اعتبار سے شخصیت سازی کے لئے چند پہلوؤں کی طرف اشارے کئے ہیں۔ جو نہ صرف مسلم طلباء وطالبات کے لئے بلکہ اوروں کے لئے بھی رہنمائی کرتے ہیں ایک جامع اور قابلِ عمل لائحہ عمل مرتب کیا جاسکتا ہے۔ اس سلسلہ میں بھی اقبال کی تعلیمات میں کئی نقوش ملتے ہیں۔

سیرت سازی کے لیے اقبال نے اطاعت اور ضبطِ نفس پر زور دیا ہے۔ اطاعت جبر کا نام نہیں ہے بلکہ دراصل یہ اختیار کی چیز ہے۔ احکام الٰہی دراصل انسانی فطرت کے عین مطابق ہیں۔ جن کی پابندی سے شخصیت میں نکھار پیدا ہوتا ہے۔ ضبطِ نفس' انسان کی شخصیت کو بے لگام ہونے سے روکتا ہے۔ شخصیت مخالف ماحول ناسازگار حالات سے گذر کر فروغ پاتی ہے۔ اسلام میں جو عبادات فرض کی گئی ہیں اُن کا مقصد انسان کے اندر ضبطِ نفس کو پیدا کرنا ہے جسے قرآن مجید کی اصطلاح میں تقویٰ کہا گیا ہے ۔تقویٰ کی روح فکر وعمل کے ہر شعبہ میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا استحضار ہے۔ خداشناسی کا نام ہے اور یہی تقویٰ ہے جو سیرت میں ایک طرح کا Self restraint پیدا کرتا ہے جو ہر قسم کی برائیوں سے محفوظ رکھتا ہے۔ عبادت یا عبدیت کا شعور اگر انسان کی شخصیت کو بڑھاوا نہ دے تو یہ اپنے مقصد کی تکمیل نہیں کرتا۔ اقبال کا ایک مشہور شعر ہے۔

نماز و روزہ و قربانی و حج
یہ سب باقی ہیں تو باقی نہیں ہے

شعر کا اہم نکتہ ہے ''تو'' باقی نہیں ہے۔ اس ''تو'' سے کیا مراد ہے؟ یہ انسانی شخصیت ہی تو ہے۔

حضور اکرم ﷺ کا مبارک ارشاد ہے کہ ہر شخص کے ساتھ اس کا شیطان لگا ہوا ہے۔ یہ شیطان ان تخریبی قوتوں کا نام ہے جو انسان کو اس کے اعلیٰ مقام و مرتبہ سے نیچے گرا کر پستیوں میں ڈھکیل دیتا ہے۔ اس لئے شخصیت سازی کے لئے ان انتشاری قوتوں سے جو انفرادی اور اجتماعی زندگی میں مختلف شکلوں اور روپ میں آتی ہیں۔ ہر لمحہ اس سے آمادہ بہ جنگ رہنا ضروری ہے۔

بدل کے بھیس پھر آتے ہیں ہر زمانے میں
اگر چہ پیر ہے آدم جواں ہیں لات ومنات
یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

شخصیت کی تعمیر کے لئے ضبط نفس نہ صرف شخصیت کو منتشر کرنے والے یا بکھراؤ کی کیفیت پیدا کرنے والے عوامل سے تحفظ ہے بلکہ یہ ایک ایسا حرکی تصور ہے جو ہمارے وجود کو بلندیوں کی طرف لے جاتا ہے اقبال نے عبادت کے تمام ارکان کے اسرار کو اس نقطۂ نظر سے دلنشیں انداز میں سمجھایا ہے۔

اقبال نے جہاں شخصیت سازی، تعمیر کردار کے مختلف پہلوؤں کو پیش کیا ہے وہیں انہوں نے ان عوامل کی بھی نشاندہی کی ہے جن سے شخصیت میں انتشار، ضعف اور انحطاط پیدا ہوتا ہے کردار کی پستی کے دو اہم سبب ہیں ایک ہوائے نفس کی پیروی اور دوسرے گدائی۔

انسان جب احکام الٰہی کی پابندی اور رضائے الٰہی کے بجائے اپنی خواہشات اور جذبات کا شکار بن کر نفس کا غلام بن جاتا ہے تو شخصیت میں ہر طرح کی مذموم صفات پیدا ہو جاتی ہیں۔ ہمارا مشاہدہ ہے کہ سماج کے اندر خود پسندی، خود بینی کتنی برائیاں پیدا کرتی ہے۔ شہرت کی تمنا، عزت و منصب کی طلب، دولت کی خواہش نہ صرف شخصیت کو پست کر دیتی ہیں بلکہ معاشرہ میں اختلافات، اور نفرتوں کو جنم دیتی ہیں۔ ایک گروہ دوسروں کو برداشت کرنے کی صلاحیت سے عاری ہو جاتا ہے۔

اسی طرح اقبال کی نظر میں گدائی ایک ایسی مذموم خاصیت ہے جو ذہن اور روح کی آزادی کو سلب کر دیتی ہے اور اسے ہر طرح کی ذلت پر آمادہ کر دیتی ہے۔ گدائی صرف بھیک مانگنے کا نام نہیں ہے بلکہ فکری اور عملی اعتبار سے وہ عمل ہے جو اس کی خودداری، بے نیازی کو ختم کر دیتا ہے۔

دوسروں کی محنت پر تکیہ کرنا بھی گدائی ہے، رشوت بھی ایک گدائی ہے، دوسروں کے افکار

وخیالات کو قبول کر لینا بھی گدائی ہے۔ یہ نہ صرف شخصی عزت و وقار کے خلاف ہے بلکہ اجتماعی زندگی کی لعنت ہے۔

پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات
جب جھکا تو غیر آگے نہ تن تیرا نہ من

اقبال نے اپنے کلام میں کئی حکایات، تشبیہات کے ذریعہ شخصیت سازی، شخصیت کے فروغ اور ترقی کے کئی پہلوؤں کو پیش کیا ہے۔ خصوصاً اقبال نے نوجوانوں کو جو درس دیا ہے اسے ہم ان کی پسندیدہ علامت شاہین کی صفات سے بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔

بہر حال اس موضوع پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ یہ بے ربط مختصر اشارات رشید انجینئر صاحب کی تحریک پر پیش کئے گئے ہیں۔ ان کا سوال تھا کہ مسلم طلباء وطالبات کی شخصیت سازی کے لئے اقبالیات سے کس طرح استفادہ کیا جا سکتا ہے؟

یہ سوال مسلم نوجوانوں کی تعلیمی اخلاقی کردار کی تعمیر کے لئے ان کی دردمندی اور تڑپ کا آئینہ دار ہے۔ لیکن بات یہاں ختم نہیں ہوتی ہے بلکہ شروع ہوتی ہے کہ شخصیت سازی کے لئے اقبال کے خیالات وتصورات کی عملی صورت گری کے لئے، موجود محدود وسائل کے روشنی میں کیا اقدامات کئے جا سکتے ہیں، کیا لائحہ عمل مرتب کیا جا سکتا ہے۔ جو بہت زیادہ آرزومندانہ نہ ہو بلکہ قابل عمل ہو۔

نہیں ہے بندۂ حُر کے لئے جہاں میں فراغ

☆☆☆

بال جبریل کی ایک نظم

''عبدالرحمٰن اول کا بویا ہوا کھجور کا پہلا درخت سرزمین اندلس میں''

تجزیاتی مطالعہ

ایک بڑے مفکر کی حیثیت سے اقبال نے دنیا کے ادبیات عالیہ کا مطالعہ بھی کیا اور جہاں جو چیز ان کو اپنی فکر و مزاج سے ہم آہنگ معلوم ہوتی ہے اسے اپنایا اور اپنی حکمت و شعر کے سانچے میں ڈھال کر دنیا کے سامنے پیش کیا۔ حکمت کی جو بات انہیں ملی اور جہاں ملی انہوں نے اسے اپنے عشق و سوز دروں کی حرارت سے پگھلا کر اور اپنی دل نواز شاعری کا رنگ و آب عطا کر کے ایک نیا قالب دیا۔ اس کی ایک مثال ان کے مجموعہ ہائے کلام میں شامل مشرق و مغرب کے بلند پایہ شعراء کی نظموں اور اشعار کے تراجم ہیں۔ اقبال کی فکر کے سانچے میں ان نظموں کا اخذ و قبول ان کی تراش خراش یہ ساری باتیں ابھی مطالعہ اقبال کا ایک تشنہ پہلو ہیں۔ زیر مطالعہ نظم اقبال کے اسی اخذ و قبول کی ایک اعلیٰ مثال ہے۔ یہ نظم یوں تو اندلس میں نئی اموی سلطنت کے بانی عبدالرحمٰن (جو الداخل کے لقب سے مشہور ہے) کی ایک نظم کا آزاد ترجمہ ہے۔

لیکن یہ ترجمہ بجائے خود اقبال کی ایک تخلیق بن گیا ہے۔ یہاں اندلس میں عبدالرحمٰن اول کا بویا ہوا کھجور کا پہلا درخت موضوع سخن ہے اور اقبال اس علامت کو ایک خاص تاریخی موقف سے بلند کر کے کائناتی پس منظر میں ایک نئے معنیٰ اور مفہوم عطا کرتے ہیں۔ یہ ایک بڑے شاعر کا کمال ہوتا ہے کہ اس کے نزدیک علامت نہ صرف اظہار و ترسیل کا ایک انوکھا پہلو پیش کرتی ہے بلکہ مذہبی اور تہذیبی پس منظر میں خود انسانی تجربہ کو بصیرت کے ساتھ سمجھنے کا وسیلہ بھی بنتی ہے۔ جہاں الفاظ کی قبا معنیٰ کے پیکر پر چست نہیں بیٹھتی وہاں ''برہنہ حرف نگفتن'' کمال گویائی بن جاتا ہے۔ علامت اور اس کی معنویت' لطیف احساسات اور کیفیات کی آئینہ دار بن جاتی ہے۔ لیکن اس رمز و ایماء اعجاز کا راز اس میں ہے کہ وہ حدیث خلوتیاں بن جائے۔ اقبال کی تراشی ہوئی اور برتی ہوئی علامتوں کا مطالعہ اس نقطہ نظر سے کیا جائے تو اس کی فکر کے بہت سے پہلو روشن

ہو جائیں۔

مسلمانوں کے مذہب، تاریخ اور خصوصاً عرب کی تہذیبی پس منظر میں اقبال کی یہ نظم قاری کو ایک نئی دنیا کی سیر کراتے ہوئے شعور و آگہی کے نئے پہلوؤں سے روشناس کرواتی ہے۔ اقبال کے ترجمہ سے قبل یہاں عبدالرحمٰن اول کی نظم کے عربی متن کو پیش کیا جاتا ہے۔ جو تاریخ المقری سے حاصل کی گئی ہے جس کا حوالہ اقبال نے اپنے ترجمہ کے ساتھ دیا ہے۔ عبدالرحمٰن باذوق شاعر تھا اس نے ادب میں بھی نئے معانی اور اسالیب کی ابتداء کی۔

تبدت لنا وسط الرصافة نخلة

تنائت بارض الغرب عن بلد النخل

فقلت شبيهى فى التغترب والنوى

نشاء ت بارض انت فيها غريبة

فمثلك فى الاقصاء والمنتائى مثلى

سقتك غوادى المزن من صوبها الذى

يسح ويستمرى المساكين بالوبل

ترجمہ: (۱) الرصافہ کے وسط میں کھجور کا ایک درخت ہمارے سامنے ہے جو ارض مغرب سے آکر **بلد النخل** کھجور کی اپنی سرزمین سے دور ہو گیا ہے۔ (۲) میں نے اس سے کہا تو بھی میری طرح غربت میں اپنی آل واولاد سے دور تنہائی کی حالت میں ہے۔

(۳) تو نے ایک ایسی سرزمین میں پرورش پائی ہے جہاں تو غریب الوطن ہے اور تنہائی و دوری میں تو میری طرح ہے۔

(۴) صبح کے بادل تیری سیرابی کریں۔ اس موسلا دھار بارش سے جو سماکین سے پانی لے کر نیچے گرتی ہے۔

اقبال کی نظم دو بندوں پر مشتمل ہے اور ہر بند میں ۵ اشعار ہیں جیسا کہ کہا گیا، پہلا بند عبدالرحمٰن اول کے چار اشعار کا آزاد ترجمہ ہے دوسرے بند کا اصل نظم سے کوئی تعلق نہیں لیکن اقبال کی نظم کا یہ دوسرا بند پہلے بند سے معنوی طور پر مربوط ہے اور یہاں کھجور کے درخت کی

علامت ایک خاص تنہائی اور تاریخی پس منظر سے بلند ہو کر آفاق کی پہنائیوں کا حاطہ کر لیتی ہے اس طرح ایک خاص انسانی تجربہ داخلیت کا اسیر نہیں رہتا بلکہ ایک آفاقی اور ماورائی حقیقت بن جاتا ہے۔

اب اقبال کی اس نظم کو پڑھ جایئے۔اس نظم کا عنوان خاصہ طویل ہے۔یعنی عبدالرحمٰن اول کا بویا ہوا کھجور کا پہلا درخت سرزمین اندلس میں،اور اس نظم سے پہلے اقبال کا یہ نوٹ موجود ہے۔

یہ اشعار جو عبدالرحمٰن اول کی تصنیف سے ہیں تاریخ المقری میں درج ہیں۔مندرجہ ذیل نظم ان کا آزاد ترجمہ ہے۔درخت مدینۃ الزہرا میں بویا گیا تھا

میری آنکھوں کا نور ہے تو — میرے دل کا سرور ہے تو
اپنی وادی سے دور ہوں میں — میرے لئے نخلِ طور ہے تو
مغرب کی ہوا نے تجھ کو پالا — صحرائے عرب کی حور ہے تو
پردیس میں ناصبور ہوں میں — پردیس میں نا صبور ہے تو
غربت کی ہوا میں بارور ہو — ساقی تیرا نم سحر ہو
عالم کا عجیب ہے نظارہ — دامان نِگہہ ہے پارہ پارہ
ہمت کو شناوری مبارک — پیدا نہیں بحر کا کنارہ
ہے سوز دروں سے زندگانی — اٹھتا نہیں خاک سے شرارہ
صبح غربت میں اور چمکا — ٹوٹا ہوا شام کا ستارہ

مومن کے جہاں کی حد نہیں ہے
مومن کا مقام ہر کہیں ہے

اب اصل نظم اور اقبال کے ترجمے کے تجزیہ سے پہلے شاید مناسب ہوگا اگر اقبال کی نظم پر غور کیا جائے۔اقبال اپنے اشعار اور نظموں کے بارے میں بڑے محتاط اور انتخاب پسند تھے ان کی نظموں کے عنوانات مختصر ہیں لیکن یہ ایک ایسی واحد نظم ہے جس کا عنوان طویل ہے

نظم کا بنیادی محور تو کھجور کا پہلا درخت ہے۔لیکن عبدالرحمٰن اول اور سرزمین اندلس دونوں کا خصوصی تذکرہ بھی اقبال نے عنوان میں ضروری سمجھا ہے۔یہاں دونوں اقبال کے نزدیک

اسلام اور تاریخ اسلام کے وسیع تناظر میں بجائے خود علامت بن جاتے ہیں۔انسانی شخصیت کا استحکام اس کے مقاصد کا اظہار، مسلمانوں کا مختلف اقوام وملل سے ربط، مختلف تہذیبوں سے اُن کا تصادم، اقدار کے ردوقبول اس سارے پس منظر میں شخصیت اور مقام کے یہ دونوں نام اقبال کیلئے بڑے معنی خیز ہیں۔اس لئے نظم کے پس منظر اور اس کے مفہوم کو سمجھنے میں عبدالرحمٰن اول اور سرزمین اندلس کا مختصر تذکرہ یہاں بے محل نہ ہوگا۔

اگرچہ سرزمین اندلس اسپین میں مسلمانوں کے قدم طارق بن زیاد اور اس کے بعد حکمرانوں کی فتوحات کی بدولت جم چکے تھے۔لیکن عبدالرحمٰن اول کو نئی اموی سلطنت کا بانی قرار دیا جاتا ہے۔عبدالرحمٰن، مشہور اموی خلیفہ ہشام کا پوتا اور معاویہ کا بیٹا تھا۔یہ ۱۱۳ھ میں دمشق میں پیدا ہوا۔اس کی تعلیم وتربیت میں اس کے دادا ہشام کا بڑا دخل تھا۔اموی سلطنت کے زوال کے بعد جب عباسیوں کو عروج حاصل ہوا تو انہوں نے حکمران اموی خاندان کے افراد کو چن چن کر ختم کیا تاکہ کوئی سیاسی حریف باقی نہ رہے۔جب اموی شہزادے قتل کئے جارہے تھے عبدالرحمٰن نے بڑی دانائی اور حوصلہ سے اپنی جان بچائی۔دریائے فرات کو تیر کر بچتے بچاتے فلسطین سے ہوتا ہوا وہ آفریقہ پہنچ گیا۔آفریقہ میں اس وقت عبدالرحمٰن بن حبیب حکمراں تھا اور اس وقت عباسی انقلاب کے اثرات پوری طرح افریقہ تک نہیں پہنچ پائے تھے۔لیکن بعد کو ابن حبیب بھی عبدالرحمٰن اول کی جان کے درپے ہوگیا۔یہاں عبدالرحمٰن اول بڑی ہوشیاری سے اپنے حلیفوں کو مجتمع کرتا رہا اور اسپین پہنچنے کی تیاری کرتا رہا۔بالآخر اپنی مہم جوئی کی بدولت زبردست خطرات پر قابو پاتے ہوئے ۱۳۸ھ میں اندلس میں داخل ہوگیا اور ۲۵ سال کی عمر میں ایک مستحکم سلطنت کی بنیاد رکھ دی جب وہ ۱۷۱ھ میں اس دنیا سے رخصت ہوا تو اسپین نہ صرف سیاسی اعتبار سے مضبوط تھا بلکہ علم وفن اور تہذیب وتمدن کا گہوارہ بن چکا تھا۔عبدالرحمٰن کی شخصیت اور اس کے کارناموں کے بارے میں مشہور عباسی خلیفۃ المنصور کی یہ رائے بڑی وزن رکھتی ہے سیاسی اعتبار سے ایک حریف اور متحارب گروپ سے تعلق رکھنے کے باوجود منصور کی تحسین حقیقت پسندی کا اظہار ہے۔

''تعریف کا مستحق تو وہ یگانہ اور فرزانہ نوجوان ہے۔جو اپنے اہل وعیال سے جدا ہوا، مصائب کی پرواہ نہ کی۔وہ اپنی دھن کا پکا تھا۔یہاں تک کہ عزت وافتخار کی بلندی پر پہنچنے کیلئے اس

نے اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال دیا اور ایک دور دراز جزیرہ میں جا نکلا اور وہاں صف بستہ فوجیں اس کے مقابلہ کیلئے موجود تھیں مگر اس نے اپنی ہمت اور فرزانگی سے انہیں شکست دی۔ اپنے حملوں سے ان کی صفیں ایک دوسرے پر الٹ دیں اور اپنی حکمت و دانائی سے ملک کے بسنے والوں کے دل موہ لئے اور سارے ملک پر اس کی بادشاہی ہوگئی۔ وہ شخص اپنے دشمنوں کیلئے قہر ہے اور اپنے عہد کا پکا ہے۔ اپنی سرحد کے پاس کسی کو پھٹکنے نہیں دیا۔ لوگ اس سے محبت بھی کرتے ہیں اور ڈرتے بھی ہیں وہ جوان قوی ہمت ہے۔''

(تاریخ اندلس از ریاست علی ندوی مطبوعہ دار المصنفین ص ۳۱۴)

منصور نے ایک مرتبہ اپنے رفقائے مجلس سے پوچھا کے قریش یعنی قریش کا باز یا شاہین کون ہے۔ حاضرین میں سے کسی نے خود منصور اور کسی نے عبد الرحمٰن بن معاویہ کا نام لیا۔ لیکن منصور نے جواب دیا۔

''صقر قریش عبد الرحمٰن بن معاویہ ہے جو نیزوں اور تلواروں کی دھار سے اپنی حیلہ گری سے بچ نکلا۔ چٹیل میدانوں کو عبور کیا۔ سمندر پر سوار ہوا، یہاں تک کہ ایک اجنبی ملک میں داخل ہوا اور شہروں پر شہر بسائے اور فوجوں پر فوجیں ترتیب دیں اور اپنی تدبیر کی خوبی اور عزم کی پختگی سے اپنی کھوئی ہوئی حکومت دوبارہ قائم کر لی۔ عبد الرحمٰن اپنی ذات سے یکا و تنہا تھا۔ صرف اس کی رائے اس کی موید اور اس کا عزم اس کا رفیق تھا''۔ (تاریخ اندلس)

منصور نے عبد الرحمٰن اول کو قریش کا باز کہا اس کے کارناموں اور شخصیت کو اقبال کی مشہور علامت شاہین کی روشنی میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اقبال نے اپنے دورہ اسپین کے موقع پر اپنی جو شاہکار نظم مسجد قرطبہ لکھی۔ اس میں اندلس کے فاتحین کا تذکرہ اس طرح کیا ہے۔

آہ! وہ مردان حق وہ عربی شہسوار — حاملِ خلق عظیم، صاحب صدق و یقیں

جن کی حکومت سے ہے فاش یہ رمزِ غریب — سلطنتِ اہل دیں فقر ہے شاہی نہیں

جن کی نگاہوں نے کی تربیت شرق و غرب — ظلمتِ یورپ میں تھی جن کی خرد راہ بیں

بوئے یمن آج بھی ان کی ہواؤں میں ہے

رنگِ حجاز آج بھی ان کی نواؤں میں ہے

اندلس یورپ میں اسلامی تہذیب وتمدن کی ایک روشن مثال ہے۔آٹھویں صدی کے آغاز میں جب کہ سارا یورپ مادی اور ذہنی اعتبار سے انحطاط اور زوال کا شکار تھا۔مسلمانوں نے ایک ایسے شاندار تہذیب وتمدن کی تخلیق کی جس کا روئے زمین پر کوئی جواب نہ تھا۔اسپین کے حکمرانوں نے سیاسی غلبہ کے ساتھ فنون لطیفہ، سائنس فلسفہ اور شعر وادب کے میدان میں بھی کارہائے نمایاں انجام دیئے۔علم وفن کے ان سرچشموں سے عیسائی مفکرین بھی فیض یاب ہوئے اور یہ بات یورپ کی نشاۃ ثانیہ کا سبب بنی۔

(The legacy of Islam-edited by Sir Thomas Arnold)

مسلمانوں نے یورپ کے دوخطوں یعنی اسپین اور سسلی پر حکومت کی اور اسلامی تمدن ان ہی راستوں سے یورپ میں داخل ہوا (عربوں نے ان دوخطوں کو اندلس اور صقلیہ کا نام دیا) تاریخ اسلام میں اندلس کے اس خصوصی موقف کی اہمیت ہمیشہ اقبال کے پیش نظر رہی۔چنانچہ اس کا اظہار اقبال کے ابتائی زمانہ یعنی ۱۹۰۵ء کی ایک نظم بلاد اسلامیہ سے ہوتا ہے۔یہ نظم اقبال کے پہلے دورہ یورپ کی یادگار ہے جس میں مسلمانوں کے بڑے مراکز کے ساتھ ہسپانیہ کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا گیا ہے۔

ہے زمین قرطبہ بھی دیدہ مسلم کا نور ظلمت مغرب میں جو روشن تھی مثل شمع طور
بجھ کے بزم ملت بیضا پریشاں کر گئی اور دیا تہذیب حاضر کا فروزاں کر گئی

یہاں اس کا ذکر بھی شاید مناسب ہوگا کہ اقبال نے ۱۹۳۲ء میں اسپین کا دورہ کیا تھا اور انہوں نے وہاں مسلمانوں کے تہذیب وتمدن کے آثار ومظاہر اور ان کے اثرات کا گہری نظر سے مطالعہ کیا اور وہاں کے ارباب علم ودانش کی فرمائش پر میڈرڈ یونیورسٹی میں ہسپانیہ اور عالم اسلام کا ذہنی ارتقاء، کے موضوع پر لکچر بھی دیا (سفرنامہ اقبال مرتبہ حق نواز ص ۱۹۵) اس سیاحت نے اقبال کے حساس ذہن پر بڑے گہرے اثرات چھوڑے۔چنانچہ یکم فروری ۱۹۳۰ء کو غلام رسول مہر کے نام اپنے ایک خط میں لکھا

''ہسپانیہ میں جو کچھ دیکھا ایک خط کے تنگ ظرف میں کیوں کر سما سکتا ہے''۔
(انوار اقبال) خصوصاً مسجد قرطبہ سے وہ جس انداز میں متاثر ہوئے اس کا ثبوت ان کی معرکتہ

الآراء نظم سے ملتا ہے ۲۷ مارچ ۳۳ء کو اپنے دوست محمد اکرام کو لکھتے ہیں۔

''میں اپنی سیاحت اندلس سے بے حد لذت گیر ہوا۔ وہاں دوسری نظموں کے علاوہ ایک نظم مسجد قرطبہ پر لکھی۔ مسجد کی زیارت نے مجھے جذبات کی اس رفعت تک پہنچا دیا کہ مجھے پہلے کبھی نصیب نہیں ہوئی تھی''۔ سفر نامہ اقبال ص ۱۹۵)

تاثر کی اسی کیفیت میں انہوں نے اپنے بیٹے جاوید کو لکھا

''خدا کرے تم جوان ہو کر اس مسجد کے انوار سے اپنی آنکھیں روشن کرو'' (گفتار اقبال ص ۱۶۵) جب اقبال وطن واپس آئے تو ممبئی کے اخبار خلافت کے نامہ نگار نے اسپین کے بارے میں چند سوالات کئے ان کے جواب میں اقبال نے کہا۔

''میں اپنے تاثرات کا اظہار الفاظ میں نہیں کر سکتا۔ بس یوں سمجھئے کہ جس طرح یہودیوں کے لئے ارض موعودہ فلسطین ہے اسی طرح عربوں کیلئے غالباً اسپین کی سرزمین موعودہ ہے''۔ (آئینہ اقبال مرتبہ محمد عبداللہ قریشی ص ۱۵)

چنانچہ یہودیوں کے فلسطین پر اپنا حق جتانے پر اپنی نظم شام و فلسطین میں انہوں نے بڑے تیکھے انداز میں کہا تھا۔

ہے خاک فلسطین پہ یہودی کا اگر حق ہسپانیہ پر حق نہیں کیوں اہل عرب کا

اسپین کے اس سفر کی یادگار اقبال کی ۶ نظمیں ہیں۔ ان میں زیر مطالعہ نظم بھی شامل ہے جو اسپین ہی کے واقعات اور پس منظر سے متعلق ہیں ان کے سوز و سرور کا اندازہ خود اقبال کے اس شعر سے ہوتا ہے۔

ہوائے قرطبہ شاید یہ اثر تیرا مری نوا میں ہے سوز و سرور عہد شباب

(یہ غزل بھی قرطبہ ہی میں لکھی گئی)۔ اسپین سے واپس ہوتے ہوئے انہوں نے اس سرزمین کو مخاطب کر کے اپنے تاثرات کا یوں اظہار کیا ہے۔

ہسپانیہ تو خون مسلمان کا امیں ہے مانند حرم پاک ہے تو میری نظر میں
پوشیدہ تری خاک میں سجدوں کے نشاں ہیں خاموش اذانیں ہیں تری بانگ سحر میں
روشن تھیں ستاروں کی طرح ان کی سنانیں خیمے تھے کبھی جن کے ترے کوہ و کمر میں

پھر تیرے حسینوں کو ضرورت ہے حنا کی ‏ ‏ باقی ہے ابھی رنگ مرے خون جگر میں

نظم کے تجزیہ سے پہلے، عبدالرحمٰن اول اور سرزمین کا یہ تذکرہ اس لئے کیا گیا کہ اس پس منظر میں اس نظم کی معنویت اجاگر ہو سکتی ہے اور یہاں اس بات کا اظہار بھی مقصود تھا کہ اقبال کو اندلس کی تاریخ، ادب اور آثار سے کتنی دلچسپی تھی۔ چنانچہ ایک اقبال شناس ڈاکٹر محمد یوسف جنہوں نے اندلس کی تاریخ و ادب کا خصوصی مطالعہ کیا ہے اس نقطہ نظر کا اظہار کیا ہے۔

''اگر اندلس کی تاریخ و ادب کے علمی مطالعہ کا اہتمام کیا جائے تو اقبال کی فکر کے کئی پہلو روشن ہو جاتے ہیں''۔ (مجلّہ اقبال لاہور اکتوبر ۱۹۶۸ء)

اب آیئے سرزمین اندلس میں عبدالرحمٰن اول کے بوئے ہوئے کھجور کے پہلے درخت کی طرف عبدالرحمٰن نہ صرف اندلس کی عظیم الشان سلطنت کا بانی تھا بلکہ دیار مغرب میں ایک نئی تہذیب کی بنیاد رکھنے والا بھی تھا۔ اس نے قرطبہ سے قریب ایک تفریح گاہ بنائی اور اس کا نام اپنے دادا ہشام کی سیر گاہ پر رصافہ رکھا۔ یہ بڑا وسیع اور پر فضا باغ تھا۔ عبدالرحمٰن نے اس کو بڑے انہماک اور شوق سے آراستہ کیا دور دراز خصوصاً دمشق و بغداد سے خوش نما درختوں اور لذیذ پھلوں کے پودے اور بیج منگوا کر لگائے۔ عبدالرحمٰن کی بہن ام اصبغ اس کیلئے شام سے میووں کے تحائف کے علاوہ پودے اور بیج بھی روانہ کرتی۔ اس کا بھیجا ہوا کھجور کا ایک پودا رصافہ میں لگایا گیا اور اس نے اس نئی سرزمین میں اپنی جڑیں مضبوط کر لیں۔

عبدالرحمٰن کو اس درخت سے بڑا انس تھا اور کہا جاتا ہے کہ وہ اسے باغ میں بیٹھا مسلسل دیکھا کرتا تھا۔ وطن سے دوری کی کیفیت میں کھجور کا یہ درخت گویا اس کا رفیق تھا۔ ہم ساز و رازداں بن گیا۔ عبدالرحمٰن صاحب علم و فضل تھا۔ ادب و شعر کا اچھا مذاق رکھتا تھا اور خود بھی شاعر تھا۔ کھجور کے اس درخت کے ساتھ اس کا تعلق قلبی مذکورہ بالا اشعار کے علاوہ عبدالرحمٰن نے کھجور کے درخت کو مخاطب کر کے اور بھی اشعار کہے ہیں۔

''اے نخل! تو مغرب میں میری ہی طرح غریب الوطن اور اصل سے دور ہے۔ تو بھی رو مگر جو گونگی ہو جو منہ ڈھانکے ہوئے ہو اور جس کی جبلت میں آہ و زاری نہ ہو، وہ بھی بھلا کبھی روئی ہے۔ اگر اسے رونا آتا تو وہ ضرور روتی، فرات کے پانی اور نخل کی سرزمین کیلئے۔

لیکن وہ بے حس ہے اور اپنے اہل خاندان کی بابت میں بھی بے حس ہو گیا ہوں یہ سبب اس بغض کے جو مجھے بنو عباس سے ہے''۔ (منتخب مقالات مجلّہ اقبال لاہور مرتبہ گوہر نوشاہی ص ۶۳ مضمون عبدالرحمٰن الداخل مضمون نگار ڈاکٹر سید محمد یوسف)

ڈاکٹر سید محمد یوسف نے ان اشعار پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

''یہ اشعار عربی ادب میں ایک نئے موڑ کی نشاندہی کرتے ہیں جس طرح عبدالرحمٰن الداخل نے ایک نئی حکومت اور سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ اسی طرح ادب میں بھی نئے معانی اور اسالیب کی ابتداء کی ایک باذوق بادشاہ ہی یہ کام انجام دے سکتا تھا۔ جو دوسروں کو خوش کرنے کیلئے قصیدہ و مدح سے بے نیاز ہو جو اپنے داخلی جذبات کے دباؤ سے مجبور ہو کر تنفیس (یعنی غم کا بیان کر کے دل ہلکا کرنا) اور تسکین خاطر کیلئے بے اختیار شعر کہے اور جو سیاست کی طرح ادب میں بھی طرز کہن کو بدلنے نہ جھجکے۔

''تجاوب مع الطبیعۃ'' یعنی فطرت سے اثر لینا اور فطرت کو اثر دینا، فطرت کے جمود کو توڑنا ،اس کو ذی روح اور ذی حس کی سطح پر لانا پھر اسے شریک اور راز داں بنا کر اپنے آپ کو گھٹن سے نجات دینا، اس کی ابتداء اندلس میں عبدالرحمٰن الداخل سے ہوئی اور یہی آگے چل کر اندلس کی عربی شاعری کی امتیازی صفت بن گئی۔ ماضی کی یاد، حسیں (Nostalgia) مجبوری اور تنہائی اس کے رومانی عناصر ہیں اور ان کی تربیت کیلئے غریب الوطنی کی فضاء ہی سازگار ہو سکتی تھی۔ جیسی کے اندلس میں تھی''۔ (حوالہ بالا)

اسپین کے مسلم حکمرانوں کا کھجور کے درخت سے لگاؤ ان کے فن تعمیر میں جھلکتا ہے۔ چنانچہ مسجد قرطبہ کے ستون اور کمانوں سے متصل ان کے بالائی حصہ کی ساخت کچھ اس طرح ہے کہ وہ نخلستان میں نخیل کے ایک جھنڈ کا منظر پیش کرتے ہیں جس کی جانب اقبال نے اپنی نظم مسجد قرطبہ میں بھی اشارہ کیا ہے۔

تیری بنا پائیدار، تیرے ستوں بے شمار شام کے صحرا میں ہو جیسے ہجوم نخیل

عبدالرحمٰن کے ان اشعار کے مطالعہ سے جن کا ترجمہ اقبال نے کیا قاری پر جو پہلا تاثر پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ شاعر اس مرئی پیکر کی تصویر اپنے آئینہ نفس میں دیکھتا ہے اور ایک مماثلت اور

یک رنگی کی کیفیت محسوس کرتا ہے۔ غربت کی ہوا میں نمواس کی معنویت کو تہدار بنا دیتی ہے۔ ان اشعار میں وطن سے دوری اور تنہائی کا احساس بھی نمایاں ہوتا ہے۔ موخرالذکر اشعار میں بنوامیہ اور بنوعباس کی کشمکش کا شدید احساس ملتا ہے لیکن زیر بحث نظم میں یہ احساس دور ہو گیا ہے۔

اور ایک مثبت پہلو سامنے آتا ہے۔ ایک نئی فضا اور ایک نئی سرزمین میں دونوں کی قوت انظہار اور نمو کی کیفیت ملتی ہے اور مزاحم ماحول میں کشمکش کا عکس نظر آتا ہے۔ ایک درخت کی نمو کیلئے حیاتیاتی اعتبار سے فطرت مزاحم بنتی ہے لیکن اس کی قوت نمو، فطرت کی رکاوٹوں پر قابو پا کر اپنی حیات کا ثبوت دیتی ہے۔

اقبال نے اپنے پانچویں خطبہ ''اسلامی تہذیب کی روح'' میں ابن مسکویہ کے حوالہ سے حیاتیاتی ارتقاء پر بحث کرتے ہوئے کھجور کے درخت کا بھی ذکر کیا ہے کہ یہ حیاتیاتی اعتبار سے نباتی زندگی کے سب سے اونچے درجہ پر ہے جس کے آگے حیوانی زندگی کی سرحد شروع ہوتی ہے۔ Date Palm میں جنس کے فرق کی بھی جھلک نظر آتی ہے اور اس کی جڑ اور ریشوں کے علاوہ ایک ایسی کیفیت ملتی ہے جو حیوانات میں دماغ کے مماثل ہے اور اس کے استحکام میں اس درخت کی زندگی کا انحصار ہے۔ (خطبات ص ۱۳۴)

عبدالرحمٰن کی نظم کا آخری شعر اس نظم کا سب سے زیادہ موثر شعر ہے اور جو اس کی اس نہایت آرزو کا ترجمان ہے کہ اجنبی فضاء میں یہ پودا بڑھتا اور پھلتا پھولتا رہے۔ اس کی تمنا ہے کہ اس درخت کی پرورش اور سیرابی صبح کے اس بادل سے ہو جو موسلا دھار بارش برساتی ہے اور جو سماکین یعنی ستاروں سے مسلسل پانی لے کر نیچے بہاتی ہے۔

عبدالرحمٰن کی اس نظم سے آگے بڑھتے ہوئے اب اقبال کی نظم کے پہلے بند کی طرف آیئے جس سے اقبال نے آزاد ترجمہ قرار دیا ہے ''وادی سے دوری'' ''مغرب کی ہوا میں نمو'' اور پردیس میں دونوں کی ناصبوری کی کیفیت کے ساتھ اقبال نے اس پیکر کے تانے بانے جن تشبیہات اور استعارات سے بنے ہیں وہ بڑے معنیٰ خیز ہیں۔ اس علامت کا مفاہیم کے احاطہ کے اقبال نے ''آنکھوں کا نور'' دل کا سرور'' نخل طور اور ''صحرائے عرب کی حور'' کے استعارے برتے ہیں۔ ان استعاروں پر غور کرنے سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ کھجور کا درخت غربت میں نہ

صرف مسرت وانبساط اور تسکین وسرور کا ایک مکانی نقطہ بنتا ہے بلکہ اس علامت کی معنویت، مذہبی ،تہذیبی اور علاقائی، تینوں سطحات پر ابھرتی ہے۔ ''آنکھ کا نور'' خارجی حواس اور اس کی موضوعی کیفیت کا نام ہے یہ نور مشاہدہ اور بصارت کا سبب بھی ہے جو اعلیٰ منزلوں پر بصیرت سے ہمکنار کرتا ہے تو آنکھ کے نور کا استعارہ محبوب ترین شئے کے اظہار کیلئے بھی برتا جاتا ہے جیسے اولاد کیلئے قرۃ العین یا نور نظر، اس طرح یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ شاید اس درخت کے ذریعہ جو اس کیلئے رعنائی و دلبری کا مظہر بھی ہے اپنے تہذیبی ورثہ کو منتقل ہوتا دیکھ رہا ہے۔

دل کا سرور اس داخلی کیفیت کا اظہار ہے جو ناظر کو سکینت اور مسرت بخشتا ہے۔ حسن کی خاصیت سرور انگیزی ہے، زندگی کی حرارت وحرکت دل ہی سے عبارت ہے اور سرور اس کو ایک دائمی فرحت بخشنے والی کیفیت ہے۔ اس طرح اقبال ان دو استعاروں میں مسرت اور بصیرت کی ساری کیفیات کو بیان کردیتے ہیں جن کا مرکز شاعر کیلئے درخت کا یہ مرئی پیکر ہے۔ اقبال نے اس نظم میں ''نخل طور'' کا استعارہ بھی استعمال کیا ہے۔ یہ تلمیح قرآن سے ماخوذ ہے۔ طور، وادی، طور ،اور شجر طور کا تذکرہ حضرت موسیٰ کے قصہ کے ضمن مین متعدد مقامات پر آیا ہے۔ یہاں قرآن مجید کی یہ دو آیات پیش کی جاتی ہیں۔

جب موسیٰ وہاں پہنچے تو وادی کے داہنے کنارے پر مبارک خطہ میں ایک درخت سے پکارا گیا کہ اے موسیٰ میں ہی اللہ ہوں سارے جہانوں کا مالک (۲۸۔۳۰)

ہم نے اس کو طور کی داہنی جانب سے پکارا اور گفتگو سے اسے تقرب عطا کیا (۵۲:۱۹)

اس طرح قرآن مجید کی رو سے وادی طور اور نخل طور، تجلی حق کی جلوہ گاہ ہیں۔ اقبال کے نزدیک وادی سینا، نخل سینا، طور، نخل طور اور شعلہ طور کے استعارے بڑے محبوب ہیں اور کئی مقامات پر انہوں نے جلوہ حق، تجلی زار حسن کے اظہار کیلئے برتا ہے۔ یہاں تجلی زار حسن کے ساتھ اس استعارے میں رفعت، بالیدگی، اور نمو کی کیفیات بھی مضمر ہیں۔ سرزمین اندلس میں کھجور کے پہلے درخت کی بلد النخل سے دوری اور خود شاعری کی اپنی وادی سے دوری کے تناظر میں اس درخت کو نخل طور کا نام دے کر وادی طور سے معنوی ارتباط پیدا کرتے ہوئے اقبال نے اس علامت کی رمزیت کے اندر ایک بے پناہ کیفیت پیدا کردی ہے۔

''صحرائے عرب کی حور'' کی تشبیہ اس علامت کو ایک نئی جہت عطا کرتی ہے جس کا ربط سرزمین عرب کے تہذیبی سرچشموں سے ہے، ایک عرب کیلئے کھجور کا درخت بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ ریگستاں میں نہ صرف روزی اور تپتی ہوئی دھوپ میں یہ سایہ دینے والا ذریعہ ہے بلکہ مسرت و انبساط کا ذریعہ بھی ہے۔ صحرائیت اور بدویت کی تحسین اقبال کے ہاں کئی جگہ ملتی ہے۔ اقبال کے نزدیک صحرائیت عربوں کی جفاکشی سادگی اور ان کی ابتدائی فطری حالت کا آئینہ دار ہے۔ اقبال نے یہاں کھجور کے درخت کو صحرائے عرب کی حور کہہ کر سادگی اور فطرت پسندی کے ساتھ دلبری اور دلربائی کی کیفیت عطا کر دی ہے۔ صحراء، ناقہ، نخیل یہ سارے علاقائی اظہار اور اس کی معنویت عربی تخیل کی دین ہیں۔

یہاں اس استعارے کے ساتھ ہمارا ذہن اقبال کی ایک دلکش اور اثر آفریں نظم ''حدی'' (نغمہ ساربان حجاز) کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ جہاں اقبال نے ناقہ کو بھی حور سے تشبیہ دی ہے۔ ایک بدوی کیلئے صحرا میں اونٹ، نہ صرف اس کا مادی سہارا ہوتا ہے بلکہ اس کا محبوب اور رفیق بھی بن جاتا ہے۔

(۱) دلکش وزیباستی : شاہد رعناستی (۲) روکش حوارستی : غیرت لیلاستی

(۳) دختر صحراستی :

تیز ترک گامزن منزل ما دور نیست

پردیس میں دونوں کی ناصبوری، آرزو کی وہ خلش ہے جو ہر آن مضطرب رکھتی ہے۔ یہ مقاصد کی لگن اور جستجو ہے کہ انسان موجود پر قانع نہیں رہتا بلکہ خوب سے خوب تر کی تلاش اسے بے چین رکھتی ہے۔ انسان کی فعلیت اور حرکت کا راز اس میں ہے کہ وہ کس طرح ماحول پر قابو پاتا ہے۔ اس تسخیر میں اس کا بنیادی جذبہ عشق ہے۔ جس کی ایک کیفیت ناصبوری ہے۔

عبدالرحمٰن نے اپنی نظم کے آخر میں یہ تمنا کی تھی کہ اس درخت کی سیرابی صبح کے ان بادلوں سے ہو جو سماکین سے پانی لے کر بارش برساتے ہیں۔ اور یہاں اقبال اس نظم کے پہلے بند کے آخری شعر میں دعا کرتے ہیں ''ساقی ترا نم سحر ہو'' یہاں سحر اور اس کی نمی دونوں بڑے بلیغ اور پر معنی ہیں۔ سحر اقبال کے ہاں بیداری اور ایک نئے انقلاب کی علامت ہے اور یہی وقت ہے جب کہ سلسلہ روز و شب میں کتاب ہستی کا ایک نیا ورق الٹا جاتا ہے۔ صبح کا وقت یوں بھی عشق کی

نیازمندیوں کیلئے مخصوص ہے۔ان قرآن الفجر کان مشھودا (قرآن مجید) کاارشاد شادابی، شگفتگی اور روحانی بالیدگی کیلئے صبح کی اثر آفرینی کا شاہد ہے۔ (اقبال کے ہاں صبح کی رفعت اور بلندی کا سب سے دل کش اظہار وہاں ملتا ہے جہاں وہ ذات رسالت مآب ﷺ کے وجود مبارک کوصلوٰۃ صبح کی پرکیف و پرسوز کیفیت سے یاد کرتے ہیں۔

در جہانِ ذکر وفکر انس وجاں   تو صلوٰۃ صبح تو بانگ اذاں

یہ تو تھی سحر اور صبح کی بات اب یہ'' نم '' کیا ہے۔یہ محض شبنم نہیں ہے جو صبح دم غنچوں کی آنکھوں سے خواب کے اثر کو دھوتی ہے اور اسے بیدار کرتی ہے۔شبنم کی نمی کی بات آہ سحر اور اشک سحر تک پہنچتی ہے۔یہاں پیام مشرق کی دلکش نظم کا ایک شعر پیش ہے جس میں کہا گیا ہے کہ رگ ایام کی نمی دراصل اشک سحر کی مرہون منت ہے۔

نم دررگ ایام زاشک سحراست (پیام مشرق۔شبنم)

فصل بہار کا یہ بند بھی پڑھ لیجئے۔

دیدہ، معنی کشااے زعیاں بے خبر

لالہ کمر در کمر

نیمۂ آتش بہ بر

می چکدش برجگر

شبنم اشک سحر

در شفق انجم نگر

دیدہ معنی کشا اے زعیاں بے خبر

اس طرح اقبال کی یہ آرزو بڑی معنی خیز ہے کہ غربت میں نمو پانے والے اس نخل کی بالیدگی نم سحر ہوتی ہے۔بات نخل تک ہی کیوں محدود ہے۔فرشتوں نے آدم کو جنت سے رخصت کرتے ہوئے ایک راز کی بات اس سے کہہ دی تھی۔

سنا ہے خاک سے تیری نمود ہے لیکن   تری سرشت میں ہے کوکبی و مہتابی
گراں بہا ہے ترا گریۂ سحر گاہی   اسی سے ہے ترے نخلِ کہن کی شادابی

اقبال کا مشاہدہ بھی یہ بتاتا ہے کہ

عطار ہو، رومی ہو، رازی ہو، غزالی ہو ۔ کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہِ سحر گاہی

اب نظم کا دوسرا بند شروع ہوتا ہے اور ایک نیا منظر طلوع ہوتا ہے اب سرزمین اندلس نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے اور سارا عالم نظر کے سامنے آجاتا ہے۔ عبدالرحمٰن کی جگہ مردِ مومن لے لیتا ہے۔ نخل کی علامت کی جگہ اسلام کی ہمہ گیر آفاقیت لیتی ہے۔ اس طرح اس علامت کی رمزیت ایک مکانی نقطہ اور جغرافیائی حد سے ماوراء ہو کر سارے عالم پر محیط ہو جاتی ہے۔

عالم کا عجیب ہے نظارہ

دامانِ نگاہ ہے پارہ پارہ

دوسرے بند کا پہلا منظر ایک دم ایک وسیع تناظر میں لے آتا ہے۔ عالم کے نظارہ کے ساتھ ہی ساری تاریخ انسانیت، اقوام وملل کا عروج وزوال، مختلف تہذیبوں کی شان وشوکت اور پھر ان کی پستی نصیبی، یہ سارے حوادث وواقعات ٹکڑوں اور وحدتوں کی شکل میں سامنے آتے ہیں۔ اور ان کا جائزہ اس نتیجہ پر پہنچاتا ہے کہ انسان اور اس کی تاریخ صاحبان عزم ہمت کے ذوق عمل کا اظہار ہے اور اس ستیزہ گاہ جہاں میں انسان کے مقاصد اور اس کے امکانات لامحدود ہیں۔ وہ اپنے عزائم اور مقصد کے جھروکوں سے اپنے مستقبل کا نظارہ کرتا ہے اور وہ اس حقیقت کو جان لیتا ہے کہ اس کا عمل محض خارجی قوتوں کا اسیر نہیں بلکہ اس کی تشکیل میں اس کا بھی ہاتھ ہے۔

ابھی بات نم سحر سے اشک سحر اور نسیم صبح گاہی تک پہنچی تھی۔ اب تیسرے شعر میں اقبال ''خاک'' اور ''شرارہ'' کے دو لفظ کہہ کر اس کے تلازمات کے ساتھ مطالب کی ایک دنیا آباد کرتے ہیں اور یہ شرارہ کیا ہے؟

نقطۂ نورے کہ نام او خودی است ۔ زیر خاک ما، شرار زندگی است

''نور'' کے اس نقطہ سے انسان کے پوشیدہ امکانات روشن ہو جاتے ہیں۔ اور یہ شرار اسے نفس گرم بھی عطا کرتا ہے اور خوابیدہ قوتوں کو بروئے کار لاتا ہے اور جب یہ سوز دروں جو عشق سے عبارت ہے مومن کے ریشہ ریشہ میں اس طرح سما جائے جیسے شاخ گل میں بادِ سحر گاہی کا نم، تو پھر وہ اس خاکداں میں رہتے ہوئے بھی خاکی نہیں رہتا بلکہ یہ شرار اس خاک کو آسمانوں کی

پرواز عطا کرتا ہے اور اگر انسان اس شرار سے بیگانہ ہو جائے تو پھر یہی خاک اس کا مزار بن جاتی ہے۔

اس شرارہ کا مبداء کیا ہے یہ ایک بحث ہے یہاں مہ وانجم کا گلہ سن لیجیے، جس سے اشارہ مل جاتا ہے۔

مہ وانجم از تو دارد گلہ ہا، شنیدہ باشی   کہ بہ خاک تیرہ ٔما زدہ ٔ شرارِ خودرا

شام کے ٹوٹے ہوئے تارہ کی صبح غربت میں چمکنے کی بات بڑی پر معنیٰ ہے۔ یہ ٹوٹا ہوا تارہ مومن کے وجود میں مدغم ہو جاتا ہے جسے ایک نئی صبح سے ہمکنار ہونا ہے۔

اب نظم اپنے آخری شعر میں نقطۂ عروج پر پہنچتی ہے لیکن اس شعر پر آنے سے پہلے ایک بات پر آپ کی توجہ کا طالب ہوں۔ آپکے سامنے یہ بات پیش نظر ہے کہ یہ نظم اقبال کے دورہ اسپین کا تحفہ ہے اور اسی سفر کی یادگار نظموں میں ہسپانیہ، طارق کی دعاء، مسجد قرطبہ وغیرہ ہیں۔

ان ساری نظموں میں ایک بات مشترک ہے اور یہ بہت اہم ہے۔ اسپین پر مسلمانوں نے بیشک حکمرانی کی اور ایک ایسی تہذیب عطا کی جس کی چمک دمک ساری دنیا کی نظروں کو خیرہ کرتی رہی۔ لیکن نہ تو مسلمانوں کی حکومت باقی رہی اور نہ اس تہذیب کا تسلسل جاری رہ سکا۔ اسپین میں مسلمانوں کی تہذیب وتمدن کے آثار اقبال نے اپنی آنکھوں سے دیکھے لیکن ان نظموں میں کہیں بھی تان مایوسی پر نہیں ٹوٹتی ''طارق کی دعا'' کا تو خیر ذکر ہی کیا۔ ابھی میں ہسپانیہ والی نظم کے چند اشعار پیش کر چکا ہوں۔ اس کا ایک شعر یاد دلانا چاہتا ہوں۔

پھر تیرے حسینوں کو ضرورت حنا ہے کی   باقی ہے ابھی رنگ میرے خون جگر میں

مسجد قرطبہ کے آخری بند کو بھی دیکھئے جہاں اقبال دریائے کبیر کے کنارے ایک اور زمانے کا خواب دیکھتے ہیں۔ جو ابھی پردہ تقدیر میں ہے لیکن جس کی سحر ان کی نگاہوں میں بے نقاب ہے۔ ان کی نظر میں وہ سارے انقلابات جن سے خود مغرب گزر چکا ہے۔ اور وہ آج کے دور میں ملت کے موجودہ کرب کو محسوس کرتے ہیں اور ان اضطرابی کروٹوں میں لذت تجدید اور بیداری کو محسوس کرتے ہیں۔ کیا یہ محض ایک خواب دیکھنے والے فلسفی یا ایک جذباتی شاعر کی خوش فہمی ہے یا ایک صاحب بصیرت کی طرح وہ مستقبل کے عکس کو اپنے آئینہ ادراک میں دیکھتے ہیں۔

اور یہاں اس نظم کا پہلا بند اس شعر پر ختم ہوا تھا کہ ''ساقی ترانم سحر ہو'' اب دوسرے بند کے آخری

شعر میں نظم اپنے عروج پر پہنچ جاتی ہے۔

مومن کے جہاں کی حد نہیں ہے مومن کا مقام ہر کہیں ہے

لیکن اقبال نے اس کی شرط بھی بیان کر دی ہے کہ اس دین کی حقیقت احتساب کائنات ہے اور مومن وہ ہے جو ہر زماں اپنے روح عمل کا حساب کرتا ہے۔ اقبال کا ''مومن'' وہ علامتی اور مثالی پیکر ہے جو اپنی خودی کا محافظ بھی ہے اور عشق کی قوت سے سرشار ہو کر ایام کا راکب بھی بنتا ہے۔ اور جس کی اذان سحر ندائے آفاق بنتی ہے۔ وہ زمین سے پیوستہ بھی رہتا ہے اور اس سے ماوراء بھی ہو جاتا ہے۔

اس طرح اس نظم میں اقبال کی حکیمانہ نظر ایک مرئی پیکر تراشتی ہے جو مذہب اور اس کے تہذیبی پس منظر سے ابھرتا ہے۔ پھر کھجور کے درخت کی ارضیت اور اس کی ماورائیت ایک طرف آفاق کی وسعتوں میں اس کے اظہار کی بے پناہ قوتوں کی ترجمان بن جاتی ہے۔ قرآن مجید میں اس حقیقت کو بیان کرتے ہوئے ایک درخت سے تشبیہ دی گئی ہے جس کی جڑیں زمین میں مضبوطی سے جمی ہوئی ہیں اور جس کی شاخیں فضائے بسیط میں پھیلی ہوئی ہے۔ قرآن مجید میں آیا ہے۔

ترجمہ۔ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ اللہ نے کلمہ طیبہ کی کیسی مثال بیان فرمائی ہے۔ وہ مشابہ ہے ایک پاکیزہ درخت کے جس کی جڑیں خوب گڑی ہوئی ہوں اور اس کی شاخیں اونچائی پر جارہی ہوں۔ ۱۴-۲۵)

یہ آیت اس حقیقت کو بھی ظاہر کرتی ہے کہ حقائق یا ابدی اقدار ثابت اور قائم رہتے ہیں لیکن ہر آن تبدیل ہوتی ہوئی اس دنیا میں اسکے اظہارات manifestations بدلتے رہتے ہیں۔ اس کو اطلاق کی سطح پر سمجھنے کیلئے اس کی معنوی وسعتوں کا احاطہ کسی خاص زماں میں مکمل طور پر ممکن نہیں۔

عبدالرحمٰن اول نے کھجور کے پہلے درخت سے مخاطب ہو کر کہا تھا۔

نشاءت بارض انت فیھا غریب

یہاں اقبال کی یہ تمنا کی ''غربت کی ہوا میں بارور ہو''۔ ہمیں ایک بلیغ حدیث کی یاد دلاتی ہے جہاں رسول اکرم ﷺ نے اسلام کو ''غریب'' فرمایا ہے۔

یہاں غربت محض اجنبیت، تنہائی اور غریب الوطنی کا نام نہیں ہے اور نہ اس کا نام روایتی

غربت یعنی تنگ دستی ہے۔ بلکہ اس کے معنیٰ ندرت فکر و عمل کے ہیں جو ہر زمانے میں نیا اظہار چاہتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس کے معنیٰ اسلام کی ابدی قدروں کو ثابت اور قائم رکھتے ہوئے اس کا زمانی اظہار ہے۔ اقبال نے جاوید نامہ میں اس حدیث کی یوں تشریح کی ہے۔

دینِ حق اندر جہاں آمد ''غریب'' از حدیثِ مصطفیٰؐ داری نصیب

غربتِ دیں نیست فقر اہل ذکر با تو گویم معنی ایں حرفِ بکر

غربتِ دیں ندرتِ آیات اوست بہر آں مردے کہ صاحب جستجو ست

نکتہ را دریاب اگر داری نظر غربتِ دیں ہر زماں نوع دگر

تا بگیری عصرِ نو را در کمند دل بہ آیات مبیں دیگر بہ بند

گویا اقبال کی اس نظم سے یہ نکتہ بھی اجاگر ہوتا ہے کہ جس طرح ایک اجنبی سرزمین میں کھجور کے درخت نے اپنی حیات کا ثبوت دیا اسی طرح اسلام کے امکانات کا اظہار بھی باقی ہے۔ جن کو زمانے کی زندہ حقیقت بننا ہے۔

یہ نظم کھجور کے درخت کی رمزیت سے شروع ہوئی لیکن آخر تک پہنچتے پہنچتے یہ مکانی نقطہ پھیل کر اسلام کی آفاقیت میں تحلیل ہو جاتا ہے۔ تاریخ کا یہ لمحہ ماضی کا لمحہ نہیں رہتا بلکہ ایک سیل بے پناہ بن جاتا ہے اور ایک شخص کی مہم جوئی مومن کی تخلیقی استعداد میں ڈھل جاتی ہے جس کے امکانات کا ظہور ابھی باقی ہے۔

مومن کے جہاں کی حد نہیں ہے
مومن کا مقام ہر کہیں ہے

☆☆☆

''ذوق وشوق'' ایک مطالعہ

اقبال کی نظم ''ذوق وشوق'' ایک ایسا حسین اور دلکش شعری پیکر ہے جس کے مطالعہ کے دوران یوں محسوس ہوتا ہے کہ ذہن کی رو موجوں کی طرح ایک دوسرے سے پیوست اس طرح تیزی سے آگے بڑھتی چلی جاتی ہے کہ درمیان میں کہیں وقوف اور قیام بڑا دشوار معلوم ہوتا ہے۔ نادر تراکیب اور استعارے، جذبات کی شدت اور فراوانی ایک ایسا تاثر اور محویت طاری کر دیتی ہے کہ معنی کی گہرائی تک پہنچنے کا مرحلہ بڑا کٹھن ہو جاتا ہے۔ ممکن ہے میرے اس تجربے کی شہادت آپ بھی دیں۔ ایک ایسی ہی کیفیت میں اس نظم کے بعض استعاروں اور علائم کو سمجھنے کیلئے میں نے کلام اقبال کے بعض مشہور شارحین کی مدد لی۔ لیکن رہ رہ کر یہ سوال ذہن میں ابھرتا رہا کہ تجزیہ وتحلیل، نقد ونظر اور جمالیاتی تحسین کے وہ پیمانے جو اقبال کی شاعری کو پرکھنے اور اس کی قدر وقیمت کو آنکنے کیلئے استعمال کئے جاتے رہے ہیں۔ کیا وہ کافی ہیں؟ یا اقبال کی شاعری، اس کے شارح اور نقاد کیلئے کچھ اور معیارات کا تقاضا کرتی ہے؟ بات اور بھی دشوار ہو جاتی ہے جب ''حدیث خلوتیاں'' کو سمجھنے کیلئے اس کے وجدانی سرچشموں کو نظر انداز کر دیا جائے۔ یہاں اقبال کے یہ اشعار شاید بے محل نہ ہوں گے۔

اگر ہو ذوق تو خلوت میں پڑھ زبور عجم
فغانِ نیم شبی بے نوائے راز نہیں

☆

زبروں در گذشتم ز درون خانہ گفتم
سخنے ناگفتہ را چہ قلندرانہ گفتم

کہیں کہیں کسی نقاد کا لہجہ نظم کے عمود تک عدم رسائی اور مختلف بندوں کے معنوی ربط کی تلاش میں عاجز رہ جانے کی وجہ سے تمسخر آمیز بھی ہو جاتا ہے۔ ایسے موقع پر اقبال کا یہ شعر بے ساختہ یاد آ جاتا ہے۔

کس ندانست کہ من نیز بہائے دارم
آن متاعم کہ شود دست زدِ بے بصراں

شاید اسی لئے اقبال کا مطالبہ ہے کہ فتوحاتِ جہانِ ذوق وشوق کیلئے جذبِ دروں کے ساتھ نگاہِ شوق بھی چاہئے، محض خردمندی کافی نہیں۔

بادلِ ما چہا کنی کہ تو بہ بادۂ حیات
مستیِ شوق می دہم آب وگلِ پیالہ را

(آپ نے میرے دل کا کیا حال کیا۔ آپ نے بادۂ حیات سے میرے بدن میں مستیِ شوق پیدا کردیا)

خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں
ترا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں

''سپاہِ تازہ برانگیزم از ولایتِ عشق'' کا نعرہ مستانہ بلند کرنے والا اقبال۔ ''بہ آں مقام رسیدم'' کہتا ہوا باخبر کردیتا ہے۔ طوافِ بام ودرِ من سعادتِ خرداست۔ اگرچہ ''سر نہ تراشد قلندری داند'' کہہ کر اپنے خمستان سے ''یک دو ساغر کش'' کی دعوت دینے والا اقبال یہ بھی جتا دیتا ہے۔

بیا کہ من زِ خُمِ پیرِ روم آوردم
مئے سخن کہ جواں تر ز بادۂ علمی

اس پس منظر میں شاید کہا جاسکتا ہے کہ ذوق وشوق جیسی نظمیں نقد ونظر کے نئے منہاج کی ضرورت کا احساس دلاتی ہیں۔ اس جملۂ معترضہ کا مقصد مطالعہ اقبال اور اقبال شناسی کے سفر میں ایک طالب علم کی دشواریوں کو اقبال شناسوں کی خدمت میں پیش کردینا ہے۔

شارحین نے اس نظم کو نعتیہ قصیدہ یا سفرِ حجاز کا بدل بھی کہا ہے لیکن بعض کلیدی تراکیب اور استعاروں کے تجزیہ اور تعبیر میں اس مرکزی خیال سے رشتہ باقی نہیں رہتا اور نظم کے محور سے اس کے مختلف بندوں کا معنوی ربط ٹوٹ جاتا ہے۔ اس لئے شاید نظم پر غور کرنے سے پہلے چند بنیادی باتوں کا تعین ضروری ہے۔ خود اس نظم کا پس منظر اور عنوان بھی نظم کے عمود تک رسائی میں مدد دیتے ہیں۔

''ذوق وشوق'' اقبال کے سفر فلسطین کی یادگار ہے۔ ۱۹۳۱ء میں دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے بعد موتمر عالمِ اسلامی کے سلسلے میں وہ فلسطین پہنچے۔ اجلاس سے پہلے عالم اسلام

کے مشاہیر اور نمائندے مسجد اقصیٰ میں جمع ہوئے اور یہ حسنِ اتفاق تھا کہ یہ رات جشنِ معراج کی تھی۔ مسجد اقصیٰ میں عالم اسلام کے نمائندوں کا اجتماع، جشنِ معراج اور اس موقع پر علامہ رشید رضا کی تفسیر آیاتِ معراج، عالم اسلام کے کرب واضطراب کا جائزہ، یہ سب باتیں ''عندلیبِ باغِ حجاز'' کو تڑپانے کیلئے مہمیز کا کام کرتی ہیں۔ اس روح پرور ماحول اور پر کیف فضا کے ساتھ ساتھ غمِ ملت، اس سارے پس منظر میں ذوق وشوق، کی کیفیات اجاگر ہوتی ہیں۔

عنوان میں ''ذوق وشوق'' کی اصطلاح اور ترکیب سے اس تاثر اور فضا کا سراغ بھی ملتا ہے جو پوری نظم میں جاری وساری ہے۔ ذوق عبارت ہے حضوری اور دید سے۔ بعض عارفین نے اسے ''درجات شہود حق کا پہلا درجہ بتایا ہے۔'' دوسرے الفاظ میں ہم اس کو یوں کہہ سکتے ہیں کہ ''یہ ایک ایسا داخلی درک جو غیر دنیاوی NON TEMPORAL اور غیر مکانی NON SPATIAL سطحوں کو بے نقاب کرتا ہے۔'' ''شوق'' لغوی اعتبار سے جوش اور عشق اور کسی چیز کو کمالِ خواہشِ دل سے طلب کرنا ہے۔ اصطلاح میں اسے کشش حقانی بھی کہا جاتا ہے۔ گویا

مقامِ شوق ترے قدسیوں کے بس کا نہیں
انہیں کا کام ہے یہ جن کے حوصلے ہیں زیاد

شوق محبوب کی طرف پرواز اور کشش ہے۔ یہاں ایک طویل حدیث شریف کا یہ بلیغ فقرہ قابلِ غور ہے کہ ''والشوق مرکبی'' (یعنی شوق میری سواری ہے) وہ سواری جو طالب کو مطلوب تک اور محبؑ کو محبوب تک پہنچا دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زبانِ رسالت مآبؐ سے یہ دعا بھی سکھائی گئی۔

اسئلک لذۃ النظر الیٰ وجھک والشوق الیٰ لقائک۔ اقبال کہتے ہیں:

میری نوائے شوق سے شور حریم ذات میں
غلغلہ ہائے الاماں بت کدۂ صفات میں

اقبال کے نزدیک زندگی، اسی طغیانِ مشتاقی سے عبارت ہے۔

اس نظم کے پس منظر اور ذوق وشوق کی ترکیب کی معنویت کی اس روشنی میں شاید یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ذوق وشوق اقبال کی ایک وارداتِ قلبی اور روحانی تجربہ ہے۔

مقام ذوق وشوق است ایں

حریم سوز وساز است ایں

یہ نظمِ ذوقِ حضوری اور سوز وسازِ فراق کے تناؤ کے درمیان اپنے عصر کے کئی بنیادی مسائل کا احاطہ کرتے ہوئے ایسے سوالات کو اٹھاتی ہے جو ہماری عصری مذہبی فکر میں نئے جہانوں کی تلاش کا شدید احساس دلاتی ہے اور ان ہی تقاضوں کے جواب میں ہمارے ملّی وجود کی معنویت کا انحصار ہے۔

اقبال نے نظم کا آغاز کرتے ہوئے بہ طور سرنامہ سعدی کا یہ شعر نقل کیا ہے۔

دریغ آمدم زاں ہمہ بوستاں
تہی دست رفتن سوئے دوستاں

''وہ اس بوستاں سے لوٹ تو رہے ہیں، ساتھ ہی تہی دستی کا احساس دامن گیر ہے۔ لیکن ان کی یہ وارداتِ ذوق وشوق ایک حسین شعری پیکر میں ڈھل کر دوستوں کیلئے تحفہ اور سوغات بن گئی ہے''۔ نظم کا پہلا بند دشت میں صبح کے سماں کی منظر کشی سے شروع ہوتا ہے۔

قلب ونظر کی زندگی، دشت میں صبح کا سماں
چشمۂ آفتاب سے نور کی ندیاں رواں

صبح یا سحر اقبال کی ایک بڑی پسندیدہ اور بلیغ علامت ہے۔ بانگِ درا کی آفتابِ صبح، آفتاب جیسی نظموں سے لے کر ضربِ کلیم کی مختصر نظم، صبح، تک کئی مقامات پر صبح کی کیفیات اور اس کے رموز وکیفیات کے اشارے ملتے ہیں۔

اقبال نے اپنے ابتدائی عہد کی نظم ''آفتاب صبح'' میں کہا تھا۔

نور سے معمور ہوجاتا ہے دامانِ نظر
کھولتی ہے چشمِ ظاہر کو ضیا تیری مگر

یہاں ساتھ ہی ساتھ اس آرزو کا بھی اظہار تھا۔

ڈھونڈتی ہیں جس کو آنکھیں وہ تماشا چاہیے
چشمِ باطن جس سے کھل جائے وہ جلوا چاہیے

اور یہاں ذوق وشوق کا یہ پہلا شعر بتاتا ہے کہ صبح کا سماں محض ظاہر کی آنکھ کا تماشا نہیں

بلکہ دیدۂ دل محو نظارہ ہے۔ یہ صبح کوئی ایسی صبح نہیں ہے جو ہر روز نمودار ہوتی ہے اور نہ یہ آفتاب وہ آفتاب ہے جو ہر دن طلوع ہوتا ہے، بلکہ یہ صبح وہ صبح ہے جو قلب ونظر کی زندگی ہے۔ یہ تمثیل کئی پہلوؤں کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ کمال یہ ہے کہ مشاہدہ کے اجزاء آفاق کے مظاہر ہیں ۔لیکن شاعرانہ شخصیت اپنے تخلیقی اظہار میں، مشاہدے کے ذریعہ خارج کے معروف موضوع کو معلوم الفاظ میں بیان کرتی ہے۔ شاعر اس کی ایسی تعبیر کرتا ہے کہ ساری فضا بدل جاتی ہے اور معنویت کے بیکراں امکانات شخصیت کے تاثر کی وجہ سے ابھرتے ہیں اور یہ مشاہدہ اس کی تخلیقی شخصیت میں منعکس ہو کر نہ صرف شاعر کی ذات کا عکاس بن جاتا ہے بلکہ قاری اور سامع کو بھی اپنے ساتھ شریک کر لیتا ہے۔

اس طرح آفتاب کا طلوع، شاعر کے نزدیک حسنِ ازل کی نمود ہے اور اس سے رواں، نور کی ندیاں، تجلیات اور انوار کا ظہور ہیں۔ جلوؤں کا وہ ہجوم ہے کہ نظر خیرہ ہو رہی ہے لیکن دل کسب فیض کر رہا ہے اور یوں ''ایک نگاہ کا زیاں'' دل کیلئے ہزار سود'' بن رہا ہے۔

حسن ازل کی ہے نمود، چاک ہے پردۂ وجود
دل کیلئے ہزار سود، ایک نگاہ کا زیاں

دامنِ نگاہ میں کتنے جلوے سمٹ آئے ہیں۔

سرخ و کبود بدلیاں چھوڑ گیا سحابِ شب — کوہ اضم کو دے گیا رنگ برنگ طیلساں
گرد سے پاک ہے ہوا، برگِ نخیل دھل گئے — ریگِ نواحِ کاظمہ نرم ہے مثلِ پرنیاں

یہ اشعار صاف ظاہر کرتے ہیں کہ صبح کا یہ منظر ارض فلسطین کا نہیں بلکہ نواح مدینہ کا ہے۔ نواح مدینہ میں حضوری کی کیفیات کے اظہار کیلئے اقبال نے عربی قصائد کی پیروی میں دیارِ حبیبؐ کے مقامات کا ذکر کیا ہے۔ قلبی کیفیات اور سوزِ دروں کے اظہار کیلئے یہ شاعرانہ اسلوب ایسا دل کش ہے کہ پاس ادب بھی رہے اور دیارِ محبوبؐ میں حضوری کا راست ذکر بھی نہ آئے بلکہ اندازِ بیان اور اس دیار کے مقامات اور آثار کے سہارے اپنی وارفتگی اور سوز وساز عشق کا اظہار ہو۔ قصیدے میں تشبیب کے معنیٰ آگ کو بھڑکانے کے بھی ہیں۔ یعنی اصل مضمون کو پیش کرنے سے پہلے محبوب سے نسبت رکھنے والی باتوں اور مقامات کا ذکر کیا جائے تاکہ آتش شوق تیز ہو۔ بوصیری کی پیروی میں کاظمہ اور کوہِ اضم کا تذکرہ اسی ایمائی کیفیت کا آئینہ دار ہے لیکن انداز کتنا

نرالا اور دلکش ہے۔ بوصیری کے مشہور قصیدے کا یہ شعر اس موقع پر بے جا نہ ہوگا۔

ام هبَّتِ الرِّيحُ من تلقاء كاظمةٍ
او اومَض البرق في الظلماء من اِضَم

(ترجمہ)

یا مگر از کاظمہ بادے وزید از کوے دوست
یا مگر در نیم شب برقے جہیدہ از اضم

(جامیؔ)

اقبال نے اپنے حسن کارانہ اظہار کے ساتھ کوہِ اضم اور نواح کاظمہ کے ساتھ جن کیفیات کا اظہار کیا ہے وہ پہلے بند کی پوری فضا سے معنوی طور پر ہم آہنگ ہیں۔ سحابِ شب کی چھوڑی ہوئی بدلیوں کو کوہِ اضم پر طیلساں کی تشبیہ نے اضم کو تقدس، وقار اور عظمت عطا کی ہے۔ رات کی بارش نے برگِ نخیل کو دھو دیا ہے، ساری فضا گرد سے پاک ہوگئی ہے اور کاظمہ کی ریت مثلِ پرنیاں نرم بن گئی ہے۔

اس منظر سے گزرتے ہوئے شاعر کی نظر بجھی ہوئی آگ اور خیموں کی ٹوٹی ہوئی طنابوں پر پڑتی ہے۔ ذوق وشوق کے اس سفر میں اس مقام پر کتنے کارواں آئے اور گزر گئے اور ان کے چھوڑے ہوئے آثار ان کی یاد دلاتے ہیں۔ قافلے والوں کی چھوڑی ہوئی سلگتی لکڑیاں ان کے سوزِ دروں کی غماز بن گئی ہیں۔

آگ بجھی ہوئی ادھر ، ٹوٹی ہوئی طناب اُدھر
کیا خبر اس مقام سے گزرے ہیں کتنے کارواں

پچھلے اشعار کا سارا پس منظر اسی مقام کو اجاگر کرتا ہے جو راہِ شوق میں سرگرمِ سفر کاروانوں کی منزل ہے۔ یہاں روح القدس کی یہ غیبی آواز اقبال کے اس مقام کی شہادت دیتی ہے۔

آئی صدائے جبرئیل تیرا مقام ہے یہی
اہلِ فراق کیلئے عیشِ دوام ہے یہی

دشت میں صبح کی نمود، چشمۂ آفتاب سے رواں نور کی ندیوں کی تہہ دار معنویت اور مقام حضوری کی کیفیات کے اظہار کے بعد دوسرے بند میں معارخ قافلۂ حجاز کی طرف مڑتا ہے۔

کسی نے لکھا ہے کہ پہلے بند کی حسین شاعری کے بعد وہی بند ھے ٹکے مضامین، وہی عشق کی تکرار بہت بے ربط معلوم ہوتی ہے۔ لیکن دوسرے بند کا پہلا شعر ہی گرہ کشائی کرتا ہے اور اس معنوی ربط تک پہنچا دیتا ہے جو پہلے بند اور دوسرے بند میں ہے۔

کس سے کہوں کہ زہر ہے میرے لئے مئے حیات
کہنہ ہے بزم کائنات، تازہ ہیں، میرے واردات

یہاں واردات تازہ کے بعد بزم کائنات میں مراجعت ہے۔ عرفان و آگہی اور عالمِ انسانیت یا تاریخ اقبال کے ہاں یہ مقامات پہلو بہ پہلو ہیں۔ اس لئے وہ ''اند کے اندرحرائے دلنشیں'' اور اس کے بعد کی منزلوں کے بعد ''جلوہ گر شو بر سر فارانِ عشق'' کی بھی دعوت دیتے ہیں۔ تنہائی سے انجمن اور خلوت سے جلوت تک سفر کی جانب بلیغ اشارے، عصری مذہبی فکر میں اقبال کی بڑی دین ہیں۔

اقبال نے انسان کے ان دو ابعاد کو مصطفائی اور کبریائی کے الفاظ میں ظاہر کیا ہے۔ ایک رخ وہ ہے جہاں وہ اپنے روحانی ربط کے ذریعے حقیقت کے سرچشمے سے قریب ہوتا ہے اور دوسرا رخ وہ ہے جہاں اس ربط کی بنیاد پر وہ اپنے زمانے پر اثر انداز ہو کر اسے منقلب کرتا ہے۔

خودی کی خلوتوں میں کبریائی
خودی کی جلوتوں میں مصطفائی

''میں یہاں پروفیسر عالم خوندمیری کی تحریر پیش کروں گا، جنہوں نے اپنے انداز میں فکرِ اقبال کے اس پہلو کی یوں وضاحت کی ہے۔'' اگر صوفی عالم ابدیت کی سیر میں گم ہو جائے تو زمانی عالم اس کی نظر میں حلقہ دام فریب بن جاتے ہیں۔ وہ اپنی نجات اس دنیا سے اور زمانی نظام سے مستقل گریز میں تلاش کرتا ہے لیکن ایسا صوفی جس نے نبوت سے فیض حاصل کیا ہو، وہ زمانی نظام سے گریز کی راہ اختیار نہیں کرتا بلکہ اس نظام کو ابدیت کے نور سے روشن کرنے کی کوشش کرتا ہے''

اپنے پانچویں خطبے میں اقبال نے اس نقطۂ نظر کو پیش کیا ہے کہ کسی روحانی تجربے کی عظمت کو جانچنے کا ایک عملی معیار یہ ہو سکتا ہے کہ اس سے معاشرے پر کیا اثرات مرتب ہوئے ہیں اسی لئے ملت کا کرب اس کیلئے تڑپ اقبال کی شاعری میں حضور رسالت مآب کی خدمت میں عرض

و نیاز سے مربوط نظر آتی ہے۔ اسرار خودی سے لے کر ارمغانِ حجاز تک رحمۃ للعالمینؐ کے حضور میں اقبال نے اپنی عقیدت اور محبت اور آپؐ کے فیضان اور احسانات کا جو تذکرہ کیا ہے وہ ملت کیلئے تڑپ کے اظہار کا لازمی جز بن گیا ہے اور کہیں کہیں تو بڑے ہی انوکھے انداز میں یہ اچانک ابھر کر سامنے آجاتا ہے۔ میں یہاں اسرار خودی سے صرف ایک مثال پیش کروں گا، تذکرہ محسنِ انسانیتؐ کی انسانوں سے غم گساری کا یوں ہو رہا ہے۔

در مصافے پیشِ آں گردوں سریر ۔۔۔ دخترِ سردارِ طئے آمد اسیر

پائے در زنجیر وہم بے پردہ بود ۔۔۔ گردن از شرم وحیا خم کردہ بود

دخترک را نبیؐ چوں بے پردہ دید ۔۔۔ چادرِ خود پیشِ روئے او کشید

اب یہاں اقبال کی یہ دل دوز آہ اچانک بلند ہوتی ہے

ما ازاں خاتونِ طئے عریاں تریم

پیشِ اقوامِ جہاں بے چادریم

عرض کرنا یہ ہے کہ اگر اقبال کی اس نظم ''ذوق وشوق'' کا محور ذاتِ رسالت مآبؐ میں حضوری ہے تو پھر ملت کے اضطراب کی طرف مراجعت نہ صرف یہ کہ بے محل نہیں ہے بلکہ ان کی پوری وجدانی شاعری کا ایک جزو لاینفک ہے۔

یہاں اقبال یہ محسوس کرتے ہیں کہ اس تاریخی گروہ کا، جسے دنیا کا سب سے زیادہ آرزومند گروہ بنایا گیا تھا۔ اپنے سرچشمہ سے ربط ٹوٹ چکا ہے۔ اسی لئے اس وارداتِ تازہ سے مراجعت کے بعد انہیں یہ بزم کائنات کہنہ نظر آتی ہے۔

ذکرِ عرب کے سوز میں فکرِ عجم کے ساز میں

نے عربی مشاہدات نے عجمی تخیلات

عرب کا سوزِ دروں اور اس کے مشاہدات اور عجم کی فکر بلند اور علمی مہمات تاریخ انسانیت کا روشن باب رہے ہیں۔ لیکن آج یہ دونوں اپنی خصوصیات اور منصب سے بے گانہ بن گئے ہیں یہاں اس سارے پس منظر میں حسینؓ ایک علامت کے طور پر ابھرتے ہیں۔ اقبال کے نزدیک حقیقتِ شبیریؓ ایک ابدی حقیقت ہے اور تاریخ کے بدلتے ہوئے اندازِ کوفی وشامی اس کی عصری

معنویت کی تلاش ضروری ہے۔ اس اسوہ میں عشق کا سوز وساز بھی ہے اور زمانہ سے ستیز وساز بھی۔ کیا آج ہمارے عصر میں عالمِ اسلام کی اضطراری کروٹیں اس بات کی گواہی نہیں دے رہی ہیں۔ عشق کی روح سے عاری ہو کر شرع ودین بھی تصورات کا بت کدہ بن گئے ہیں اور شاید قافلۂ حجاز کی افسردگی کا علاج اقبال کی اس نوا میں ہے۔

ریگِ عراق منتظر ، کشتِ حجاز تشنہ کام
خونِ حسینؓ باز دہ کوفہ وشام خویش را

غیرتِ عشق کسی اور کی محبت کو دل میں جگہ نہیں دے سکتی۔ لذت آشنائی دو عالم سے دل کو بے گانہ کر دیتی ہے۔ شعلۂ نمرود میں تپ کر صدقِ خلیل کندن بنتا ہے اور میدانِ کربلا میں عشق غیور اپنے خون میں نہا کر سرخ رو ہے۔ گویا ملت کے مرکز محسوس اور وحدت کی بنیاد عشق پر استوار ہے اور اس کی آب یاری خونِ حسینؓ سے ہے۔ کعبہ سے کربلا تک اس سفر میں کتنی معنویت پنہاں ہے۔ صدقِ خلیل اور صبر حسینؓ کے ساتھ بدر وحنین کا اس شعر میں تذکرہ اس حقیقت کی بھی یاد دلاتا ہے کہ عشق محض حرا کی تنہائی سے عبارت نہیں بلکہ بدر وحنین کی معرکہ آرائی کا بھی نام ہے۔

صدق خلیل بھی ہے عشق ، صبرِ حسینؓ بھی ہے عشق
معرکہ وجود میں بدر وحنین بھی ہے عشق

اسی لئے تیسرے بند میں اقبال نے ذاتِ رسالت مآبؐ سے اس ٹوٹے ہوئے ربط کو دوبارہ استوار کرنے کی بات کہی ہے۔ تیسرے بند کے آغاز میں اقبال نے ذاتِ ختمی مرتبتﷺ کیلئے ''آیہ کائنات کا معنی دیریاب'' کا نادر استعارہ برتا ہے۔ اس استعارے کی تعبیر میں ایک نقطۂ نظر یہ بھی ہے کہ انسان ہی آیۂ کائنات کا اصل معنیٰ ہے جس کی تلاش میں رنگ وبو کے قافلے سرگرداں ہیں، یا یہ کہ اس سے مراد مومن ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ انسان خلاصۂ کائنات ہے اور تخلیق وارتقاء کی آخری منزل۔ لیکن آیۂ کائنات میں کوئی معنیٰ نہیں پیدا ہوتے جب تک کہ ''مظہر لولاک'' نہ ہو۔ تصور خلافت کا بھی تقاضا ہے کہ تمام کمالات ایک ایسی ہستی پر ختم ہوں جو تمام اسماء وصفات کی مظہر اتم ہو۔ ساری کائنات کا خلاصہ بے شک انسان ہے، لیکن عالمِ انسانیت کی تربیت انبیائے کرام کے ذریعے ہوتی رہی اور اقبال کے نزدیک مختلف انبیاء کا ظہور در اصل مدارجِ محمدیہﷺ کا تدریجی ظہور ہے۔ صاحب گلشن راز نے بڑی خوبی سے یوں اس رمز کو سمجھایا ہے۔

نبوت را ظہور از آدم آمد
کمالش در وجودِ خاتم آمد

اس بند کے پہلے شعر سے یہ حقیقت ظاہر ہوتی ہے کہ ذات ختمی مرتبتؐ ہی عالم انسانیت کا معنیٰ دیریاب اور مقام ومنزل ہرراہرو، ہےاور تلاش مصطفیؐ اس کا سفر۔ تلاش مصطفیؐ محض ایک سکونی عمل نہیں بلکہ مسلسل حرکت ہے۔اس بند کے دوسرے ہی شعر میں اقبال کی یہ فریاد بھی ہے۔

خلوتیانِ مدرسہ کور نگاہ و مُردہ ذوق
جلوتیانِ مے کدہ کم طلب وتہی کدو

یعنی زندگی کے خارجی اور باطنی پہلوؤں میں رہبری کرنے والے دونوں گروہ حرکت وبصیرت سے عاری ہیں۔ایک کی ذمہ داری خارجی پیکر کی برقراری اور تحفظ سے ہےاور دوسرے کا تعلق باطن کی شادابی اور خلاقی سے ہے۔لیکن جزئیات اور فروعات پر غیر متوازن اصرار نے قافلۂ حیات کوسعادت کی راہ سے ہٹا دیا ہے۔ نہ تو مکتبوں میں رعنائی افکار ہےاور نہ خانقاہوں میں لذت اسرار۔

اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے غم ناک
نہ زندگی ، نہ محبت نہ معرفت نہ نگاہ

اس پس منظر میں اقبال کی نوا کا مقصود، اسی آتش رفتہ کا سراغ ہے جس کے وجود سے تب وتابِ زندگی اورحرکت وحرارت قائم تھی۔

میری تمام سرگذشت کھوئے ہوؤں کی جستجو | میں کہ میری غزل میں ہے آتش رفتہ کا سراغ
میرے نفس کی موج سے نشو نمائے آرزو | باد صبا کی موج سے نشو ونمائے خار وخس
ہے رگِ ساز میں رواں صاحب ساز کا لہو | خونِ دل وجگر سے ہے میری نوا کی پرورش

کھوئے ہوؤں کی جستجو بے روح احیاء پسندی اور ماضی پرستی نہیں بلکہ ان ابدی اقدار کی بازیافت ہے جن پر انسانیت کی بنیادیں استوار ہوئیں، ماضی کے تجربات سے روشنی حاصل کرتے ہوئے اسے حال کا جز بنانا ہےاور ایک نئے جہان کی تعمیر کا حوصلہ اسی سوز وساز آرزو سے ملتا ہے، جس کی نشو ونما شاعر کی موجِ نفس سے ہوتی ہے۔اقبال نے ایک مقام پر کہا تھا۔

تلاش اس کی فضاؤں میں کر نصیب اپنا
جہانِ تازہ مری آہِ صبح گاہ میں ہے

یہاں خود اقبال کا اپنا عرفان بھی ہے جو اپنے عصر کے تقاضوں میں ایک ایسی علامت کے طور پر ابھرتا ہے جس کی تلاش وجستجو اسی سرچشمۂ فیض کی اپنے عصر میں بازیافت ہے جس کا مقصد اپنی نوا سے زمانہ کے خاکستر میں دبی ہوئی چنگاری کو بھڑ کانا ہے۔ اس نوا کی پرورش خونِ جگر سے ہے۔ دردوسوز کیلئے شگاف سینہ یعنی دردِ عشق بھی ضروری ہے۔ نَے سے نکلتی ہوئی صدائے درد محض ہوا کا زیر و بم نہیں ہے بلکہ اس میں نے نواز کی تپش عشق بھی شامل ہے۔ اس لئے اقبال کی آرزو سکون کی نہیں بلکہ تڑپ میں اضافے کی ہے کہ اسی بے قراری اور سوز ساز سے زندگی عبارت ہے

فرصتِ کش مکش مده ایں دلِ بے قرار را
یک دو شکن زیاده کن گیسوئے تاب دار را

چوتھے بند کے آغاز میں لوح، قلم اور الکتاب، ایک ہی حقیقت کے ظہور کے مدارج ہیں جن میں ایک کلی وحدت ہے۔ یہاں بھی اشارہ اس ذات گرامی کی طرف ہے جو نگاہِ عشق و مستی میں اول بھی ہے اور آخر بھی۔ آپؐ کا وجود ہی وجہِ تخلیق کائنات ہے اور اس وجود بسیط کے آگے یہ گنبدِ آبگینہ رنگ حباب سے بڑھ کر نہیں۔ آپؐ کے ظہور کا مقصد، ایک ابدی روحانی اساس پر عالم انسانیت کی وحدت کی تشکیل بھی ہے اور اس کی حرکت کی برقراری بھی۔ آپؐ ہی کی نگاہِ کیمیا اثر نے ذروں کو سنوارا اور انہیں آفتاب بنادیا۔

آگے کے تین اشعار میں اقبال نے ذاتِ ختم الرسلؐ کے احسانات کا تذکرہ کرتے ہوئے زندگی کے ان پہلوؤں کو پیش کیا ہے جو بہ ظاہر ایک دوسرے سے متضاد نظر آتے ہیں، لیکن دراصل ایک اکائی کے دولازمی اور تکمیلی اجزاء ہیں۔ جلال اور جمال، قیام اور سجدہ، عقل اور عشق یہ تمام ایک ہی کُل کے دورخ ہیں اور ان ہی پہلوؤں کے باہمی ربط اور امتزاج سے انسانی وجود کی مکمل تصویر بنتی ہے۔ یہ ذات رسالت مآبؐ کا فیضان ہے کہ زندگی کا ہر پہلو اپنے کمال کو پہنچ گیا۔ قہاری وغفاری، قدوسی وجبروت کے بہ ظاہر متضاد عناصر ہی سے سیرت کی تکمیل ہوتی ہے۔ اسی لئے اقبال کہتے ہیں کہ شوکتِ سنجر و سلیم، آپؐ کی شانِ جلالی کا ایک رخ ہیں اور جنید و بایزیدؒ میں آپؐ

کی شانِ جمالی کی جھلکیاں ہیں۔

قیام اور سجدہ کے استعارے بھی اقبال کے ہاں معنویت سے بھرپور ہیں۔ قیام میں جلالِ کبریائی اور سجدہ جمالِ بندگی سے عبارت ہے اور یہ دونوں پہلو ذاتِ مصطفیٰ سے ہی مستنیر ہیں۔

فقر وشاہی وارداتِ مصطفیٰؐ است   ایں تجلی ہائے ذاتِ مصطفیٰؐ است
ایں دُو قوت از وجودِ مومن است   ایں قیام وآں سجودِ مومن است

نماز بہ حیثیت کل ان دو پہلوؤں سے عبارت ہے جو ہمارے پورے ذہنی رویہ کو متعین کرتی ہے اور جسے معراجِ مومن بھی کہا گیا ہے اور اگر صاحبِ معراجؐ کی محبت جادۂ ذوق وشوق کے مسافر کی رہنما بن جائے تو یہی ولولۂ شوق اسے لذتِ پرواز عطا کرتا ہے۔ اس کے بغیر اقبال کے نزدیک قیام اور سجدہ دونوں حجاب بن کر محض ایک رسم بن کر رہ جاتے ہیں۔

اس بند میں اقبال عقل اور عشق کے دونوں پہلوؤں کا بھی جائزہ لیتے ہوئے کہتے ہیں کہ دونوں آپؐ کی نگاہِ ناز سے مراد پا گئے۔ تلاش اور جستجو عقل کا نصیب ہے اور سوز وسرور واضطراب عشق سے عبارت ہے۔ عام طور پر غیر متوازن انداز میں یہ بات کہی جاتی رہی ہے کہ اقبال عقل کے مخالف ہیں۔ لیکن یہ شعر اس نقطۂ نظر کی نفی کرتا ہے۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ عقل کی تقدیر میں حضور نہیں، لیکن اس کا اپنا منصب بھی ہے جس کی تکمیل عشق سے ہوتی ہے۔ خطبات میں اقبال نے اسلام میں عقل استقرائی کی اہمیت کو ختم نبوت کا ایک فیضان قرار دیا ہے۔

اس بند کی ابتدا ذاتِ وجہِ تخلیقِ کائنات کیلئے لوح، قلم اور الکتاب کے استعاروں سے ہوئی تھی جو ایک کلی حقیقت کا اظہار ہیں۔ جیسا میں نے ابھی عرض کیا ہے۔ اس بند میں اقبال نے جن مختلف اقطاب کو برتا ہے جو ایک ہی اکائی کے تکمیلی اجزاء ہیں جو ذاتِ ختمی مرتبت کے فیضان سے اپنے کمال کو پہنچتے ہیں۔

تیرہ وتار ہے جہاں گردشِ آفتاب سے
طبعِ زمانہ تازہ کر جلوۂ بے حجاب سے

یہاں اس بات کا بھی اشارہ ملتا ہے کہ آج کے عصر کا المیہ یہ ہے کہ زندگی کا ہر ادھورا پہلو

اپنے مکمل ہونے کے دعویٰ کر رہا ہے اور ہر جز اپنے دیگر تکمیلی اجزاء سے الگ ہو کر انسانی رویہ پر اثر انداز ہو رہا ہے۔ اس لئے اس بند میں اقبال کی التجا یہی ہے کہ گردشِ آفتاب سے دل کی دنیا روشن نہیں ہو سکتی۔ اس آفتاب سے زندگی کا ایک رخ منور ہوتا بھی ہے تو دوسرا رخ تاریکی میں رہتا ہے۔ اس خارج و باطن دونوں کے نکھار اور شادابی کیلئے آپؐ ہی کے جلوہ کی تنویر چاہیے تاکہ زمانہ ایک نئی زندگی سے ہم کنار ہو۔ مشرق کا رجحان انفس کی سیر رہا اور مغرب خارج میں کھو گیا اقبال انسانی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کے درمیان کمال توازن اور وحدت کی کارفرمائی چاہتے ہیں جس کی معراج انہیں ذات رسالت مآبؐ میں ملتی ہے۔

آخری بند کے آغاز میں اقبال یہ عرض کرتے ہیں کہ طلب و جستجو میں ایک عمر بسر کرنے کے بعد مجھ پر یہ راز کھلا ہے کہ علم شجر بے ثمر ہے اور عشق ہی اصل حیات ہے۔ یہاں علم یعنی محض مجرد عقل منزل آشنا نہیں کر سکتی لیکن اگر زمامِ کار عشق کے ہاتھ میں ہو تو قافلۂ حیات اپنے وجود کی تکمیل تک پہنچ سکتا ہے۔ اس دور میں بھی عقل اور عشق کا یہ معرکہ تازہ ہے۔ اقبال کے نزدیک کاروانِ شوق کی منزل عشق مصطفیٰؐ اور اس منزل تک عدم رسائی بولہبی ہے۔

بہ مصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اُوست
اگر بہ اُو نرسیدی تمام بولہبی است

اس عشق کا معاملہ بھی عجیب ہے کہ کوئی تو منزل کی جستجو میں عمر گزار دیتا ہے اور کبھی یہ حال ہوتا ہے کہ ''طئے شود جادۂ صد سالہ آہے''۔

دوسرے بند میں بھی اقبال نے عشق کی اہمیت پر زور دیا لیکن وہاں اس کی سمت عالمِ تاریخ ہے اور یہاں اس کی جہت عارفانہ ہے۔

اب یہاں نظم کا اہم ترین پہلو ''فراق'' اجاگر ہوتا ہے۔ عالمِ سوز و ساز میں وصل کی نہیں، فراق کی اہمیت ہے۔ فراق ہی تکوین اور تکمیل کا سبب ہے۔ اقبال کے نزدیک انسانی خودی کا استحکام فراق کی بہ دولت ہے اور فراق عشق کا آئینہ دار ہے۔

جدائی خاک را بخشد نگاہے دہد سرمایہ کوہے بہ کاہے
جدائی عشق را آئینہ دار است جدائی عاشقاں را ساز گار است

فراق کے پہلو کی عارفانہ جہت کو اقبال نے گلشنِ راز جدید اور زبورِ عجم کے کئی اشعار میں

پیش کیا ہے۔ اقبال کا کہنا ہے کہ فراق کی بدولت فنا، بقا سے ہم دوش ہوتی ہے۔

چہ خوش سودا کہ نالد از فراقش　　ولیکن ہم بالد از فراقش
خودی را تنگ در آغوش کردن　　فنا را بقا ہم دوش کردن

اس بات کو سمجھنے میں شاید ڈاکٹر عابد حسین کی اس وضاحت سے مدد مل سکتی ہے۔

عشق کی تین منزلیں ہوتی ہیں، آرزو یا جستجو، دید اور وصل، قدیم شعراء کے یہاں اس تیسری منزل کا مقصود یہ ہے کہ طالب، مطلوب کے اندر اس طرح فنا ہو جائے جیسے قطرہ دریا میں محو ہو جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ محدود اور محدود کے وصل کا اس کے سوا کوئی تصور بھی نہیں ہو سکتا۔ مگر اقبال کے نزدیک عشق کی صرف دو ہی منزلیں ہیں۔ پہلی منزل سوز و گداز کی ہے اور دوسری کیفیت دیدار کی جو راحت بخش بھی ہے اور اضطراب افزا بھی۔ تیسری کوئی منزل نہیں۔ لذتِ دیدار سے کامیاب ہونے کے بعد نفس انسانی روحِ مطلق سے جدا رہتا ہے اور دردِ جدائی سے تڑپتا ہے۔ یہی اس کی فطرت اور یہی اس کی تقدیر۔ (بہ حوالہ مجلّہ اردو اقبال نمبر ۱۹۳۸ء)

میں مزید تفصیل کیلئے پروفیسر عالم خوندمیری کے دو جملے پیش کرنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے عالمانہ انداز میں اس پہلو کو یوں پیش کیا ہے۔ ''اقبال کو ابد اور زمانہ کے تناؤ کی برقراری ہی میں انسانی شخصیت کی تکمیل کے امکانات نظر آتے ہیں۔ اس لئے وہ ایک ایسے مردِ مومن کا جویا ہے جو لمحہ وصال سے لمحاتِ فراق کی جانب واپس آنے کی طاقت رکھتا ہے جس میں تخلیق کے امکانات پوشیدہ ہیں''۔ (اقبال کشش اور گریز)

فراق اقبال کا اتنا محبوب موضوع رہا ہے کہ انہوں نے خواجہ حسن نظامی کو لکھا تھا کہ انہیں ''سرالوصال'' کے بجائے ''سرالفراق'' کہا جائے لیکن یہ عجیب بات ہے کہ آج بعض ناقدین کے نفسیاتی تجزیے کے ضمن میں تہذیبی اور سیاسی سطح پر بھی فراق کی کارفرمائی دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اب ''ذوق و شوق'' کا سلسلہ منزل تک پہنچ رہا ہے۔ میں نے ابتداء میں عرض کیا تھا کہ یہ نظم ذوقِ حضوری اور فراق کے تناؤ کے درمیان آگے بڑھتی ہے۔ اس کشمکش کا اظہار اقبال یوں کرتے ہیں۔

عین وصال میں بھی، مجھے حوصلۂ نظر نہ تھا
گرچہ بہانہ جو رہی، میری نگاہ بے ادب

سوز وسازِ آرزو، لذتِ وصال سے زیادہ عزیز ہے۔ اسی لئے اقبال فراق کے اس مقام کے رمز شناس بن جاتے ہیں کہ اس میں لذتِ طلب ہے مسلسل سفر۔

گرمیِ آرزو فراق، شورشِ ہائے وہو فراق
موج کی جستجو فراق ، قطرہ کی آبرو فراق

غرض اس حسین اور دل کش شاہکار نظم میں ایک طرف تو اقبال کے داخلی تجربے کی ساری نزاکتوں اور جذب وسرور کا رچاؤ ہے تو دوسری طرف اس کی جلو میں غمِ انسان اور غم ملت کے تقاضے ہیں جو ان کی تخلیقی شخصیت کا ایک اہم جذبہ ہیں وہ ان دونوں پہلوؤں کا ایک ایسی سطح سے اظہار کرتے ہیں جہاں ان کو الگ الگ دیکھنا یا دکھانا ناممکن ہو جاتا ہے۔ اس کا سارا حسن اس نظم کی معنوی وحدت میں سمٹ کر نمایاں ہو گیا ہے۔ اس طرح نظم ''ذوق وشوق'' ایک مکمل شعری کارنامہ، مربوط آہنگ اور جذبہ وفکر کے توازن کی انوکھی مثال بن گئی ہے۔ کرب واضطراب کے لمحاتی تاثر کو فکر کے شاداب اظہار کی خلاقی نے بے کراں بنا دیا ہے۔ حیرت اس وقت ہوتی ہے جب اس نظم کی ترکیب اپنی موضوعاتی پیچیدگی کے باوصف اقبال کی پوری معنوی شخصیت سے ہم آہنگ ہو جاتی ہے۔ جہاں شاعری اور عرفان کی روح اثر آفریں اظہار کے قالب میں، انسانی تجربے کی طرح نہ صرف ہم سے ہم کلام ہو جاتی ہے بلکہ اپنے تجربے کے انمٹ نقش بھی مرتسم کر دیتی ہے۔ (اقبال ریویو۔ اپریل ۱۹۹۳ء)

☆☆☆☆

اذان، صلوۃ، قیام اور سجدہ
(اقبال کی شاعری میں)

یہ ہمارا اور آپ کا تجربہ ہے کہ جب ہم اقبال کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہیں تو اسلوب بیان کی دلکشی، طرز ادا کی زیبائی، صوتی آہنگ کا اعجاز، الفاظ کا قرینہ و انداز، ایک محویت کی سی کیفیت طاری کر دیتے ہیں۔ شدت تاثر کی اس منزل سے آگے نئی تراکیب و تشبیہات نئے استعارات اور علائم کی ایمائیت، رمزیت اور اشاریت، معانی و مفاہیم کی بے پناہ وسعتوں اور گہرائیوں میں پہنچا دیتی ہے اور پھر تاریخی اور عصری شعور کی شائستہ عکاسی اقبال کی خلاق اور توانا فکر کو اپنے عہد کے لئے بامعنی بنا دیتی ہے اس سے آگے ایک اور منزل بھی ہے جسکی جانب اقبال نے متعدد مقامات پر اشارہ کیا ہے، جہاں وجدانی سرچشموں سے سیراب ہوکر، باطن کی سرشاری و شادابی، شاعری کو حدیث خلوتیاں بنا دیتی ہے۔ اب یہاں وہ قاری سے جذب دروں اور نگاہ شوق کے ساتھ ''یک لحظہ بہ دل درشو '' کا مطالبہ کرتی ہے۔ اس منزل پر یہ بات آشکار ہو جاتی ہے کہ فغان نیم شی بے نوائے راز نہیں۔

دمِ عارف نسیمِ صبحدم ہے
اسی سے ریشہ معنی میں نم ہے

اس تناظر میں اقبال کی شاعری میں ان اصطلاحات کا مطالعہ بھی خاصا دلچسپ ہے جو ٹھیٹ مذہبی شعائر سے متعلق سمجھی جاتی ہیں۔ کہیں کہیں یہ اصطلاحات دلکش تشبیہات، استعاروں اور علامتوں کا روپ بھی اختیار کر لیتی ہیں لیکن جہاں کہیں انداز سادہ و بیانیہ ہے وہاں بھی الفاظ کے روایتی پیکروں میں ایک نیا جہان معنی آباد نظر آتا ہے۔ موضوع خشک وعظ و تلقین نہیں بنتا بلکہ شاعر کی خوش بیانی لطیف اور نازک نکات کو نہایت ہی دل پذیر اور پر اثر پیرایہ میں پیش کرتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ ان کا باہمی ربط و ضبط انھیں اقبال کے کل نظام فکر کا ایسا جز بنا دیتا ہے جس کے وسیلہ سے

ہم اقبال کے وجدانی اور تخلیقی سفر میں ان کے ہم سفر بن کر جدّت معنی اور ندرتِ فکر کی نئی منزلوں سے آگاہ ہوتے ہیں۔ مذہبی شعائر کے ظاہری پہلو کی ضرورت اہمیت اور افادیت مسلّم، لیکن یہاں اقبال نے جس پہلو سے انھیں بیان کیا ہے ان کا تعلق باطن کے نکھار اور خلاقی سے ہے جو انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے دونوں پہلوؤں سے مربوط ہے۔ ان معروضات کے بعد میں اپنی بات کا آغاز اذان سے کرنا چاہتا ہوں۔

بانگ درا کی ابتدائی شاعری میں شاعر فطرت کا ہمراز ہے' آپ کے ذہن میں یہ اشعار ہوں گے جہاں انھوں نے صبحدم کویل کی کوک کو اذان اور اسے موذن سے تشبیہ دی ہے

جاگے کوئل کی اذان سے طائران نغمہ سنج
ہے ترنم ریز قانون سحر کا تار تار (نمود صبح)
پچھلے پہر کی کوئل وہ صبح کی موذن
میں اس کا ہم نوا ہوں وہ میری ہم نوا ہو

اسی طرح گلستان میں غنچہ گل اس وجہ سے موذن ہے کہ اس کی چٹک اذان سحر کی طرح صبح صادق کے طلوع ہونے کا اعلان ہے۔

چٹک او غنچۂ گل' تو موذن ہے گلستان کا

اقبال کی ابتدائی شاعری میں اذان اور موذن کی تشبیہات کے اس حوالہ سے فکر اقبال کے تدریجی ارتقاء کا پہلو واضح ہوتا ہے۔ اب آیئے راست اقبال کی اس نظم کی طرف جو بال جبریل میں شامل ہے اور جس کا عنوان ہی ''اذان'' ہے۔

یہ نظم ہیئت اور اسلوب کے اعتبار سے انوکھی ہے اور ایک ڈرامائی کیفیت کو لئے ہوئے ہے۔ اس ڈرامہ کا اسٹیج افلاک کی فضائے بسیط ہے اور اس کے کردار ہیں ''نجم سحر'' یعنی صبح کا ستارہ' مریخ' زہرہ اور مہہ کامل اور وقت صبح کی آمد آمد کا ہے مکالمہ کا انداز یوں ہے کہ نجم سحر آدمِ خاکی کے بارے میں سوال کرتا ہے۔

اک رات ستاروں سے کہا نجم سحر نے
آدم' کو بھی دیکھا ہے کسی نے کبھی بیدار

آدم ناشناس مریخ کچھ بیزار سا نظر آتا ہے۔

کہنے لگا مریخ ادا فہم ہے تقدیر
ہے نیند ہی اس چھوٹے سے فتنے کو سزاوار

زہرہ بھی سوال کا راست جواب دینے کے بجائے پیچھا چھڑانا چاہتا ہے اور یوں طنز بھی کرتا ہے۔

زہرہ نے کہا اور کوئی بات نہیں کیا۔؟
اس کرمکِ شب کور سے کیا ہم کو سروکار ؟

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ مریخ اور زہرہ دونوں مقام آدم خاکی سے نہ صرف بیگانہ نظر آتے ہیں بلکہ ان کا رویہ بھی کچھ مخالفانہ اور رقیبانہ سا ہے۔ لیکن مہِ کامل بہ اعتبار قرب مکانی اور اس خاکداں کے طواف کی وجہ سے آدم خاکی کا مقام شناس اور اس کے اسرار سے آگاہ ہے' اس کا جواب ہے۔

بولا مہِ کامل کہ وہ کوکب ہے زمینی
واقف ہو اگر لذت بیداری شب سے
اونچی ہے ثریا سے بھی یہ خاکِ پُر اسرار
آغوش میں اس کی وہ تجلی ہے کہ جس میں
کھو جائیں گے افلاک کے سب ثابت و سیار

اب اس آخری شعر پر نظم ڈرامائی انداز لئے ہوئے اپنے کلائمکس کو پہنچ جاتی ہے یہ فنکار اقبال کی خوبی ہے۔

ناگاہ ! فضا بانگ اذاں سے ہوئی لبریز
وہ نعرہ کہ ہل جاتا ہے جس سے دل کو ہسار

مہِ کامل کے اس جواب کی کیا معنویت ہے اس بات پر آگے غور کریں اور اس سے قبل ضرب کلیم کے ایک قطعہ ''صبح'' کے علاوہ ایک اور نظم ''عالم نو'' کا مطالعہ کرلیں تا کہ اس مجموعی تناظر میں اذاں کی معنویت کے مختلف پہلو واضح ہو جائیں۔

''صبح'' کے نام سے موسوم قطعہ بھوپال میں لکھا گیا' مسجدوں کے شہر بھوپال میں صلوۃ فجر کے لئے دی جانے والی اذانیں' اقبال کے دل میں ایک سوز و سرور اور وجد و انبساط کی کیفیات پیدا

کر دیتی ہیں ان احساسات کو وہ کمال بلاغت اور فنکارانہ انداز میں ان دو اشعار میں سمو دیتے ہیں۔

یہ سحر جو کبھی فردا ہے' کبھی ہے امروز
نہیں معلوم کہ ہوتی ہے کہاں سے پیدا
وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستان وجود
ہوتی ہے بندہ مومن کی اذاں سے پیدا

صبح اقبال کا محبوب استعارہ ہے' صبح خود فراموشی اور خواب سے بیداری کا لمحہ ہے۔ ظلمت کے نور میں بدل جانے کا وقت ہے۔ فرحت اور شادابی سے عبارت ہے۔ لیکن اس صبح سے وہ صبح مراد نہیں جو روز نمودار ہوتی ہے۔ بلکہ یہ صبح وہ صبح ہے جس سے چشم باطن کھل جاتی ہے۔ یہ صبح وہ صبح ہے جو قلب ونظر کی زندگی ہے۔ اس اشارہ سے اقبال کی شاہکار نظم ''ذوق وشوق'' کا یہ شعر آپ کے ذہن میں تازہ ہو گیا ہوگا۔

قلب ونظر کی زندگی دشت میں صبح کا سماں
چشمہ آفتاب سے نور کی ندیاں رواں
خورشید وہ عابد سحر خیز
لانے والا پیامِ برخیز

یہ آفتاب بھی وہ آفتاب نہیں جو ہر روز طلوع اور غروب ہوتا ہے بلکہ

وہ آفتاب جس سے زمانے میں نور ہے
دل ہے' خرد ہے' روح رواں ہے' شعور ہے

اس قطعہ کے پہلے شعر میں تجاہل عارفانہ اور اغماض کا پہلو ہے کہ اقبال کو اس سحر سے بحث نہیں جو سلسلہ روز شب کی اسیر ہے۔ بلکہ وہ سحر جو ایک جہان تازہ کی آمد کی دلیل بنے۔ شبستان وجود نور کے عدم ظہور کی کفیت سے عبارت ہے جہاں تاریکی ہے' سناٹا ہے' بندہ مومن نور ازل سے مستنیر ہے' جس کی گونج سارے آفاق میں سنائی دیتی ہے۔ شبستان وجود میں' ارتعاش مومن کی اذاں کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے اور اذاں اس بیداری کی علامت بن جاتی ہے جس کی گونج سارے آفاق میں سنائی دیتی ہے۔

دنیا کی عشاء ہو جس سے اشراق
مومن کی اذاں ندائے آفاق

بال جبریل کی نظم ''اذاں'' اور ضرب کلیم کے اس قطعہ کے آخری اشعار کو ذہن میں رکھتے ہوئے اب آیئے ضرب کلیم کی نظم ''عالم نو'' پر ایک نظر ڈالیں ۔ یہ نظم بھی نہایت مختصر لیکن بلیغ اور صرف تین اشعار پر مشتمل ہے

زندہ دل سے نہیں پوشیدہ ضمیرِ تقدیر
خواب میں دیکھتا ہے عالم نو کی تصویر
اور جب بانگ اذاں کرتی ہے بیدار اسے
کرتا ہے خواب میں دیکھی ہوئی دنیا تعمیر
بدن اس تازہ جہاں کا ہے اسی کی کف خاک
روح اس تازہ جہاں کی ہے اسی کی تکبیر

تقدیر مخفی ہوتی ہے' لیکن دل زندہ سے پوشیدہ نہیں رہتی' تقدیر کھلے ہوئے مستقبل کی طرح اس کے سامنے موجود ہوتی ہے ۔ یہاں میرے خیال میں خواب ایک Vision ہے اور مومن ایک Visionary ہوتا ہے ۔ اس طرح اذاں یہاں خواب سے بیداری اور اس کی عملی تعبیر ہے ان نظموں کے مجموعی تناظر میں اب آیئے اجمالاً اذاں کی معنویت' اس کی مختلف جہتوں کو سمیٹ لیں اذاں ایک نئی صبح کی بشارت ہے ۔ عشق کا وہ ترانہ اور نالۂ مستانہ ہے، جس کا سوز و سرور ایک نئے عالم کا نقشبند ہے ۔ اذان لذت بیداری شب کے ذوق و سرور سے آشنا ہونے کے بعد سارے ماحول میں ایک حرکت کی کفیت پیدا کر دینے کے عزم کا اعلان ہے ۔ اللہ کی عظمت و کبریائی کے اعلان کے بعد جب جانِ بیدار مومن کے دل میں پیدا ہو جاتی ہے تو اس کے اندر ان قوتوں کو انگیز کر دیتی ہے جو سارے ماحول میں لرزہ پیدا کر دیتی ہیں ۔ مومن وہ Visionary ہے جس کی بصیرت کے سامنے مستقبل ایک کھلے ہوئے امکان کی طرح ہوتا ہے ۔ جو محض تقدیر کے بہانہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھتا بلکہ ایک نئی دنیا کی تعمیر کا عزم اور حوصلہ رکھتا ہے ۔ یہاں اس بات کی وضاحت شاید ضروری ہوگی کہ اذاں کے بارے میں یہ مفاہیم اور رموز اذاں کے کلمات سے غیر

متعلق نہیں بلکہ معنوی طور پر ان سے مربوط ہیں۔ پہلے اللہ کی کبریائی کا اعلان چار سو پھیل جاتا ہے توحید اور رسالت کی شہادت مومن کے وجود کو نہ صرف بامعنی بناتی ہے بلکہ اس شہادت سے ہی اس کی شناخت بھی بنتی ہے اور منصب کا بھی تعین ہوتا ہے۔ اس کے بعد ہی وہ صلوٰۃ اور فلاح کی دعوت کا پاسدار، نگہدار اور امین بنتا ہے، اذان فجر میں ''الصلوٰۃ خیر من النوم'' کی تکرار بھی معنی خیز ہے۔ پھر مزید دو مرتبہ اللہ اکبر کے اعلان کے بعد یہ تکبیریں اب شش جہات پر محیط ہو جاتی ہیں۔ اقبال کہتے ہیں کہ جب اذاں کی یہ روح نظروں سے اوجھل ہوتی ہے جس کی نظر صرف ظاہر پر ہوتی ہے اور جو باطن کے سوز و ساز سے بیگانہ رہ جاتا ہے اس لئے اقبال ملاّ کی اذاں اور مجاہد کی اذاں میں فرق کرتے ہیں۔

الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن
ملاّ کی اذاں اور مجاہد کی اذاں اور

ارتقائی اعتبار سے اقبال نے اذاں کی معنویت میں ایک اور رخ کا اضافہ کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ یہ کہن پیکر جس کا نام دنیا ہے عناصر کے ربط اور ضبط سے تشکیل پایا ہے جس میں ارتقاء کا عمل جاری رہا۔ اس نے کئی نیستان بوئے تا آنکہ ایک نالہ بلند ہوا۔ کتنے ہی چمن خوں ہوئے تب کہیں جا کر اک لالہ اگا۔ بگاڑ اور بناؤ کا سلسلہ جاری رہا۔ یہاں تک کہ زندگی کی لوح پر تیرا نقش ثبت ہوا کشت جاں میں نالہ و فغاں اگتے رہے تا آنکہ اک نوائے اذاں کی گونج فضاء میں بلند ہوئی۔

نالہ ہا در کشتِ جاں کاریدہ است
تا نوائے یک اذاں بالیدہ است (رموز بیخودی)

اب اذاں کے ضمن میں ایک آخری لیکن اہم بات رہ گئی ہے جو فکر اقبال کا ایک نادر اور اچھوتا پہلو ہے۔ اذاں کو وہ ایک نئی پیدائش یعنی زادنِ نو کی علامت قرار دیتے ہیں اس طرح اذاں کی معنویت کو ایک نیا رخ دیتے ہیں۔ یہ زادنِ نو کیا ہے؟ اس کو سمجھنے کے لئے نہایت ہی اختصار سے اس کے پس منظر کو اجاگر کرنا شاید ضروری ہے، میں چند منتخب اشعار کے حوالوں پر اکتفا کروں گا۔ جاوید نامہ میں پیر رومی، زندہ رود یعنی اقبال کو معراج کے اسرار بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں

بر مقامِ خود رسیدن زندگی است
ذات را بے پردہ دیدن زندگی است

یہ بات زندہ رود کو مضطرب کر دیتی ہے' وہ سوال کرتے ہیں کہ اس دنیائے آب و گل سے رہائی کیسے مل سکتی ہے اور پیش حق رسائی کیونکر ممکن ہے۔ رومی جواب دیتے ہیں یہ ممکن ہے اگر نکتہ ''الا بسلطن'' تیرے ہاتھ آجائے جس طرح مادر رحم سے اس دنیا میں تیری ایک پیدائش ہے اسی طرح زماں اور مکان کی حدوں کو توڑ کر ایک نئی پیدائش یعنی زادنِ نو ممکن ہے' انسان کا اس دنیا میں پیدا ہونا اس کے اختیار میں نہیں ہے لیکن ایک نئی پیدائش اس کے اختیار میں ہے۔ ایک پیدائش پردوں میں نہاں ہے اور دوسری آشکار اور عیاں ہے وہ باگریہ ہے اور یہ باخندہ ہے۔ وہ سکون اور سیر اندر کائنات ہے یہ سراپا سیر بیروں از جہات ہے اس وضاحت کے بعد آپ اقبال کے صرف دو کلیدی اشعار سن لیں۔

ہردو زادن را دلیل آمد اذاں
آں بہ لب گویند وایں از عین جاں
جان بیدارے چو زاید در بدن
لرزہ ہا افتد دریں دیر کہن

یعنی ہر دو پیدائشوں کی دلیل اذاں ہے ایک ہونٹوں سے نکلتی ہے اور دوسری عینِ جاں سے ادا ہوتی ہے یہ جان بیدار جب کسی تن میں بیدار ہوتی ہے تو اس سے یہ جہان کہنہ لرز اٹھتا ہے زماں اور مکاں کے بندھن ٹوٹ جاتے ہیں۔ یہی زادنِ نو ہے جو شخصیت کی معراج کی تمہید ہے جس کی دلیل بھی اذاں ہے۔

اذاں کے بعد اب آیئے صلوۃ کے لئے مسجد یعنی سجدہ گاہ کی طرف۔ اس بارے میں شاید ایک دو باتوں کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔

اس موضوع پر تین نظمیں ''پیرس کی مسجد'' ''مسجد قوت الاسلام'' اور مسجد قرطبہ اقبال کے نقطۂ نظر کو ظاہر کرتی ہیں' لیکن یہاں ان کا تجزیہ مقصود نہیں۔

''نور'' اسلامی فکر میں ایک خاص رمزیت کا حامل ہے۔ نور الوہی وجود کی تمثیل اور علامت ہے یعنی Symbol of Divine Presence نور کی یہ رمزیت خصوصا مسلم ماہرین فن تعمیر کے پیش نظر رہی چنانچہ فن تعمیر کی شاہکار مساجد میں رنگ و نور کا انعطاف اور انعکاس کا حسین اور نفیس اظہار

نظر آتا ہے۔اذاں کی بات ابھی آپ نے سنی۔ وہ مینار جہاں سے اذاں دی جاتی ہے عربی میں المنار کہلاتا ہے جونور سے ہی مشتق ہے یعنی The place of light غرض مساجد میں نور کے ارتکاز کے پہلو کو خاص طور پر ملحوظ رکھا گیا۔ مسجد قرطبہ کا یہ شعر اس بات کی وضاحت کے لئے کافی ہے۔

تیرے در و بام پر وادئ ایمن کا نور
تیرا منار بلند جلوہ گہہ جبرئیل

ٹائٹس برک ہارٹ نے اپنی کتاب میں بڑے پتہ کی بات لکھی ہے کہ مسلمان ماہرین تعمیر پتھر کو بھی موج نور میں تبدیل کر سکتے ہیں اس سلسلہ میں گائی ایٹن (حسن عبدالحکیم) کا یہ تبصرہ بڑا دلکش ہے ''یہ مقدس آرٹ اسلام کے بنیادی پیغام کو تقریر اور تحریر کے ذرائع ابلاغ کے مقابلہ میں کہیں بہتر اور براہ راست واضح کرتا ہے۔ اس آرٹ کے ذریعہ ایمان حواس خمسہ کے لئے زیادہ قابل فہم بن جاتا ہے۔ ٹائٹس برک ہارٹ کے حوالہ سے گا آیٹن نے ایک دلچسپ واقعہ کا تذکرہ کیا ہے ۔کہ انگلستان کی ایک استانی اپنے شاگردوں کی ایک جماعت کو لیکر ٹیونس گئی جہاں قیروان کی مسجد دیکھنے کے بعد ایک لڑکا یوں بے ساختہ کہہ اٹھا۔''مس (Miss) مجھے پہلے یہ بات معلوم نہ تھی کہ مذہب بھی اتنا خوبصورت ہوسکتا ہے۔''

لیکن اقبال نے اس بات کو بھی پیش کیا ہے کہ مسجد کی تعمیر میں محض شان وشوکت' نزاکت اور دلربائی ہو' لیکن اس کی فضاء میں جبین شوق لذت سجدہ سے ناآشنا رہ جائے اور دلوں کی کشود میسر نہ آئے تو یہ کمال ہنر بے معنی ہے اس خیال کو اقبال نے اپنی نظم '' پیرس کی مسجد'' میں پیش کیا ہے۔ ''مسجد قوت الاسلام'' میں جلال کا پہلو نمایاں ہے جسکی سنگینی کے سامنے غلامی کی وجہ سے مسلمانوں کا وجود مثل زجاج شرمندہ ہے۔ مسجد قوت الاسلام سے اقبال یوں مخاطب ہوتے ہیں۔

ہے تیری شان کے شایاں اسی مومن کی نماز
جس کی تکبیر میں ہو معرکہ' بود و نبود
اب کہاں مرے نفس میں وہ حرارت وہ گداز
بے تب وتاب دروں مری صلوۃ اور درود
کیا گوارا ہے تجھے ایسے مسلمان کا سجود ؟

اقبال کے نزدیک مسجد روحانیت اور ارضیت کے امتزاج کا ایک حسین مرئی پیکر ہے۔ مسجد روحانی انبساط اور اعلی اخلاقی قدروں کی ترویج کا وسیلہ رہی ہے لیکن اب صورت حال یوں دگرگوں ہے کہ روح کی بالیدگی اور شخصیت کے ترفع کا پہلو کم سے کم تر بلکہ نظروں سے اوجھل ہے اب اقبال کے اس سوال کا کون جواب دے۔''

تمام عارف و عامی خودی سے بیگانہ
کوئی بتائے یہ مسجد ہے یا کہ میخانہ

یہاں ایک اور بات کے تذکرہ کی اجازت دیجئے۔ صلوٰۃ میں ضروری شرط وضو کی ہے جو حضوری سے پہلے کثافت' غفلت' پژمردگی اور سستی کو دور کر کے بیداری اور آمادگی کی کیفیات پیدا کرتا ہے لیکن اقبال اس وضو کی بات کرتے ہیں جس کا نم آنکھ سے قلب میں اتر کر باطن کو پاکیزہ اور شاداب کرتا ہے اشک سحرگاہی سے وضو کے بعد صلوٰۃ کی کیفیات کچھ اور ہوتی ہیں صلوۃ منزل عرفان تک رسائی کا وسیلہ بھی ہے اور بیداری ءذات کا ذریعہ بھی ہے جب اقبال یہ کہتے ہیں کہ

نماز و روزہ و قربانی و حج
یہ سب باقی ہیں تو باقی نہیں ہے

صلوۃ بہ شمول دیگر عبادات اسی ''تو'' کی بازیافت ہے۔ اظہار عبودیت میں خود انسان کے شرف و عظمت اور اس کی آزادی کا راز پنہاں ہے۔ ورنہ ہر در کی گدائی اس کا مقدر بن جاتی ہے۔ ملا اور مجاہد کی اذاں کے فرق کی طرح اقبال غلاموں اور مردان حر کی نمازوں کے فرق کو بھی پیش کرتے ہیں ترکی کے ایک مجاہد نے اقبال سے یہ سوال کیا تھا

طویل سجدہ ہیں کیوں اس قدر تمہارے امام

اقبال نے یوں جواب دیا تھا

طویل سجدہ اگر ہیں تو کیا تعجب ہے
ورائے سجدہ غریبوں کو اور کیا ہے کام ؟

مردان حر کے ذوق عمل کی وجہ سے امتوں کا نظام قائم ہے۔ مردان حر کی صلوۃ کی کیفیت کا مشاہدہ ہمیں اقبال ''جاوید نامہ'' کی سیر افلاک میں فلک عطارد پر کرواتے ہیں' جہاں ارواح جمال

الدین افغانی اور سعید حلیم پاشا کی زیارت ہوتی ہے۔ اقبال اس سفر میں ایک ایسے مقام پر پہنچتے ہیں جہاں خوش منظر وسیع صحرا ہے جس کے دامن میں بہنے والے دریا کی نغمگی دل کو لبھاتی ہے۔ ناگاہ! فضا میں آوازِ اذاں بلند ہوتی ہے اقبال رومی سے پوچھتے ہیں اس مقام پر حیات کے کوئی آثار نظر نہیں آتے لیکن یہ اذاں کی آواز کہاں سے بلند ہو رہی ہے۔

رومی جواب دیتے ہیں یہ دشت اولیاء ہے۔ یہ خاکداں ہماری خاک سے آشنا ہے۔ یہ مقام عارفوں کی زیارت گاہ ہے۔ آو! شاید ہمیں صلوۃ کا موقع نصیب ہو جائے اور سوز و گداز کے چند لحات میسر آجائیں۔ دونوں آگے بڑھتے ہیں تو کیا دیکھتے ہیں کہ دو مرد حالت قیام میں ہیں' امام جمال الدین افغانی اور مقتدی سعید حلیم پاشا ہیں اس دشت خوش میں افغانی سورہ النجم کی تلاوت کر رہے ہیں۔ صلوۃ کو معراج المومنین کہا گیا ہے اور سورہ النجم میں معراج نبویؐ کا تذکرہ ہے۔ یہ مناسبت بڑی معنی خیز ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ افغانی کی قراءت میں وہ سوز و تڑپ ہے کہ حضرت خلیلؑ وجد میں آجائیں اور روح پاک جبرئیل جھوم اٹھے۔ قلب داود میں سوز و مستی کی کیفیت طاری ہو جائے۔ اس پر سوز قراءت کا یہ عالم ہے کہ قبروں کے سکوت اور خاموشی سے شور الا اللہ اٹھے۔

سورہ والنجم و آں دشتِ خموش   قراءتے آں پیر مردے سخت کوش
روحِ پاک جبرئیل آید بوجد   قراءتے کز وے خلیلؑ آید بوجد
شورِ الا اللہ خیزد از قبور   دل ازو ' در سینہ گردد ناصبور
سوز و مستی می دہد داود را   اضطراب شعلہ بخشد دود را
بے حجاب ام الکتاب از قراءتش   آشکارا ہر غیاب از قراءتش

مثنوی ''مسافر'' میں اقبال اس نماز کا بھی ذکر کرتے ہیں جو انھوں نے کابل میں نادر شاہ شہید کی اقتداء میں پڑھی تھی۔ وہ کہتے ہیں کہ اس قیام و سجدہ کے راز کو بجز ''بزم محرماں'' اوروں کے سامنے بیان نہیں کیا جا سکتا۔

آں کہ مومن را کند پاک از جہات   وقت عصر آمد صدائے الصلوۃ
کردہ ام اندر اقتدائے او نماز   انتہائے عاشقاں سوز و گداز
جز بہ بزمِ محرماں نتواں کشود   راز ہائے آں قیام و آں سجود

قیام اور سجدہ

قیام اور سجدہ، صلوۃ ہی کے بنیادی ارکان ہیں، تاہم اقبال نے ان دونوں اصطلاحوں کو کبھی یکجا اور کبھی علیحدہ پیش کرتے ہوئے ان کی معنویت کو نئے رخ دیئے ہیں۔ لالہ طور کی پہلی رباعی ہی ہمیں چونکا دیتی ہے۔

شہید ناز او بزم وجود است
نیاز اندر نہاد ہست و بود است
نمی بینی کہ از مہر فلک تاب
بہ سیمائے سحر داغ سجود است

سجدہ کو اقبال نے مقام بندگی سے آگے مقام عاشقی تک لا کھڑا کیا ہے

مقام بندگی دیگر مقام عاشقی دیگر
زنوری سجدہ می خواہی، زخاکی بیش ازاں خواہی
شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام
میرا قیام بھی حجاب، میرا سجود بھی حجاب

ارمغان میں انھوں نے ایک ایسے سجدہ کی آرزو کی ہے جس سے زمین وآسماں وجد میں آجائیں اور جس کے سوز وحرارت سے پتھر بھی پگھل جائیں۔

سجودے اُو کہ از سوز و سرورش
وجد آرم زمین و آسماں را

حضور رسالت، میں یوں التجا کی ہے کہ اس خوش صحرا میں جہاں سے قافلے درود وسلام پڑھتے ہوئے گزرتے ہیں گرم ریگ پر ایسے سجدے نصیب ہو جائیں جس کی تپش سے جبیں پر داغ سوزاں نمایاں ہو جائے۔

چہ خوش صحرا کہ دردے کارواں ہا
درودے خواند و محمل برآند
بہ ریگ گرم او آور سجدے
جبیں را سوز تا داغے بماند

سجودِ زندہ مرداں کی کیفیت کا اظہار یوں ہوتا ہے

سجود زندہ مرداں می شناسی
عیار کارِ من گیر از سجودم

ورنہ جس طرح اذاں روح بلالیؓ سے محروم ہو کر محض ایک رسم بن جاتی ہے اسی طرح سوز و سرور سے خالی سجدہ بھی ایک رسم بن کر رہ جاتا ہے۔

ور نہ داری خون گرم اندر بدن
سجدۂ تو نیست جز رسمِ کہن
صفین کج دل پریشان سجدہ بے ذوق
کہ جذب اندرون باقی نہیں ہے

اقبال نے بات اتنی آگے بڑھادی ہے کہ خدا کے حضور بھی یوں عرض کرتے ہیں

دگر گوں عالم شام وسحر کر
جہان خشک و ترزیر وزبر کر
رہے تیری خدائی داغ سے پاک
مرے بے ذوق سجدوں سے حذر کر

اب میں مزید تفصیل میں گئے بغیر ان اشعار کو پیش کروں گا جہاں انھوں نے قیام وسجدہ کی علامتوں کو یکجا پیش کرتے ہوئے ایک نئی معنویت عطا کی ہے۔

قیام

اقبال کے نزدیک قیام جلال کبریائی اور سجدہ جمال بندگی کی علامت ہے ایک اور مقام پر اقبال نے یہ نہایت دلنشین نکتہ بیان کیا ہے شاہی قیام کا رمز ہے اور فقر سجدہ کا اور یہ دونوں ذات مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے مستنیر ہیں۔

فقر وشاہی واردات مصطفےٰؑ است
ایں تجلی ہائے ذات مصطفےٰؑ است
ایں دوقوت از وجود مومن است
ایں قیام و آں سجودے مومن است

قیام میں سرورِ ناز ہے اور سجدہ میں سوزِ نیاز۔ قیام' مقام استقامت اور سجدہ' مقام تفویض اور سپردگی۔ قیام و سجدہ کی یکجائی اگر علحدگی میں بدل جائے اور دونوں ایک دوسرے سے بے تعلق رہ جائیں تو اقبال کے نزدیک یہ زندگی کے ادھورے اور یک رخے پن کا اظہار ہیں بلکہ کاروبار جہاں میں کوئی کسی صرف ایک ہی رخ کو اپنالے تو ایسے انسان کا وجود بے معنی ہو جاتا ہے۔ یہ رمز اقبال کی شاعری کا منفرد پہلو ہے۔

تیرا نیاز نہیں آشنائے ناز اب تک
کہ ہے قیام سے خالی تیری نماز اب تک

آہ قومے کہ بے تب و تاب حیات
روزگارش بے نصیب از واردات
آں یکے اندر سجود ایں در قیام
کاروبارش چوں صلوٰۃ بے امام

ابلیس اس بات پر خوش ہے کہ

ہے ازل سے ان غریبوں کے مقدر میں سجود
ان کی فطرت کا تقاضا ہے نمازِ بے قیام

اور ہندوستان میں بعض ملا بھی اس بات پر رضامند ہیں

ملا کو جو ہے ہند میں سجدہ کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

اقبال نے یہ شعر تقریباً ساٹھ سال پہلے لکھا تھا لیکن آج بھی پڑھتے ہوئے مجھے یہ احساس ہوتا ہے کہ اقبال کہیں یہ بات تو نہیں کہہ رہے ہیں کہ سجدہ کی تو اجازت ہے لیکن قیام کی نہیں۔ اس لئے عصر ناشناس' اسلام کی بصیرت سے بے بہرہ اماموں کے بارے میں اقبال نے کہا تھا اور بڑی دردمندی سے کہا تھا

قوم کیا چیز ہے قوموں کی امامت کیا ہے؟
اس کو کیا سمجھیں یہ بیچارے دو رکعت کے امام

کبھی مضطرب ہو کر کہہ اٹھتے ہیں

تیرا امام بے حضور تیری نماز بے سرور
ایسی نماز سے گذر ایسے امام سے گذر

اس لئے اقبال اس سجدہ کی تمنا کرتے ہیں جس کا مقام قیام کے بعد ہے اور جس میں ملت کی زندگی کا پیام ہے۔

خدا نصیب کرے ہند کے اماموں کو
وہ سجدہ جس میں ہے ملت کی زندگی کا پیام

تاریخ کے دھوپ اور چھاؤں میں اقبال نے ان اصطلاحوں اور علامتوں کے سہارے عروج و زوال کی داستان بھی کہی ہے۔

سنی نہ مصر و فلسطین میں وہ اذاں میں نے
دیا تھا جس نے پہاڑوں کو رعشہ سیماب

کبھی ان صحرا نشینوں کی جنھوں نے ظلمت کے دور سے نکل کر دنیا کو ایک نئی تہذیب سے روشناس کیا تھا یہ کیفیت تھی

کیا تو نے صحرا نشینوں کو یکتا
خبر میں ' نظر میں ' اذان سحر میں

اس لئے اقبال یوں جھنجوڑتے ہیں

اس خاک میں دب گئی تیری آگ
سحر کی اذاں ہوگئی اب تو جاگ

اور یہ آرزو کرتے ہیں

کیا عجب میری نوائے سحر گاہی سے
زندہ ہوجائے وہ آتش کہ تیری خاک میں ہے
تلاش کر اس کی فضاوں میں نصیب اپنا
جہان تازہ مری آہ سحرگاہ میں ہے

اقبال اپنے بارے میں کہتے ہیں کہ رومی کی طرح انہوں نے موجودہ سکوت اور جمود کی فضاء میں وہ آوازءاذاں بلند کرتے ہوئے اسرار جہاں سے آگاہ کیا ہے۔

چو رومی درحرم دادم اذاں من
ازو آموختم اسرار جاں من
بہ دورِ فتنۂ عصر کہن او
بہ دورِ فتنۂ عصرِ رواں من

یہی نہیں بلکہ یاران طریق کو دعوت بھی دیتے ہیں کہ آؤ! از ندگی کی بازی پھر ایک بار مردانہ وار ہمت اور حوصلہ سے کھیلیں اور اس امت کی بگڑی بنائیں' مسجد میں کچھ اس درد سے آہ نالہ بلند کریں کہ بے سوز دل ملاّ بھی پگھل جائے اور اسے اپنا منصب یاد آ جائے

بیا تا کارِ ایں امت بسازیم
قمارِ زندگی مردانہ بازیم
چناں نالیم اندر مسجد شہر
کہ دل در سینۂ ملاّ گدازیم

اقبال کے اس جذب دروں' سوز نہاں' تڑپ اور اضطراب کا روحانی سرچشمہ وہی ذات گرامیؐ ہے جس کے ظہور کو اقبال ''شباب زندگی'' اور جس کے جلوہ کو ''تعبیر خواب زندگی'' کہتے ہیں اس مضمون میں جن اصطلاحات اور علامتوں کے اظہار کی نئی نئی جہتوں کو پیش کیا گیا ہے ان کا حسن عارفانہ اظہار یوں نقطہءکمال کو پہنچ جاتا ہے

درجہانِ ذکر و فکرِ انس و جاں
تو صلوٰۃِ صبح تو بانگِ اذاں

☆☆☆☆☆

دوا ہر دکھ کی ہے مجروحِ تیغِ آرزو رہنا

''زندگی میں خواہش کی تکمیل اور عدم تکمیل دونوں حزنیہ ہیں۔'' برنارڈ شاہ کا یہ قول انسانی خواہشات' آرزدوں کے بارے میں ایک نقطہ نظر کی نمائندگی کرتا ہے' خواہش بجائے خود اچھی ہے یا بری یہ سوال مذہبی' اخلاقی اور نفسیاتی اعتبار سے موضوع بحث رہا ہے۔ ظاہر ہے یہاں خواہش سے مراد انسان کی فطری خواہشات اور احتیاجات نہیں' نہ ان خواہشات سے بحث ہے جو مذموم سمجھی جاتی ہیں۔ بلکہ یہاں آرزو سے مراد وہ خواہش یا تمنا ہے جسے انسان اپنے دل میں پروان چڑھائے رکھتا ہے اور جس کے حصول کے تمنائے مضطرب اور بے چین رکھتی ہے۔ وہ آرزو جو اعلیٰ انسان کو اعلیٰ تر منازل سے ھمکنار کرتی ہے۔

مذہبی اعتبار سے ان تعلیمات میں جو مہاتما بدھ سے منسوب ہیں یہ بات ملتی ہے کہ خواہش بری چیز ہے اس لئے اس سے گریز کرنا چاہیے۔ بدھ مت میں انسانی انا یا شخصیت کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ ان کے نزدیک زندگی ایک بہتا دریا ہے جس میں موجیں آتی اور گزر جاتی ہیں۔ یعنی وہ محض کیفیات اور واردات کا سلسلہ ہے۔ ذاتی قدر بے معنی ہے لیکن جب انسان اپنے تشخص یا انا' کو باقی رکھنے کی کوشش کرتا ہے تو اس کا نتیجہ مصائب و آلام اور رنج و غم کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ جہاں ذاتی تشخص کی بات ہوگی وہیں ذاتی پسندیدگی اور ناپسندیدگی کے جذبات اور اس کے ساتھ خواہشات کا پیدا ہونا لازمی ہے۔ لیکن اکثر و بیشتر انسان کی خواہش کی تکمیل پوری طرح ممکن نہیں ہوتی جو وہ پسند کرتا ہے اسے حاصل نہیں کر سکتا اور جو ناپسند کرتا ہے اس سے بچ نہیں سکتا۔ اس لئے مہاتما بدھ کے نزدیک ہر خواہش فریب ہے۔ فریب اس لئے ہے کہ ہر خواہش کے پیچھے جو انسان کو بے چین بنائے ہوئے ہے یہ خیال کارفرما رہتا ہے کہ خواہش کی تکمیل ہو جائے تو طمانیت اور سکون مل جائے لیکن ایسا نہیں ہوتا بلکہ دوسری خواہش سر اٹھاتی ہے اور یوں اس کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے

اس لئے ہماری جدوجہد کا حاصل سوائے اضطراب اور بے چینی کے کچھ نہیں اس لئے خواہش سارے شر کی جڑ ہے جس سے بچنا ضروری ہے اور یہ اس طرح ممکن ہے کہ نفس کشی اختیار کی جائے۔ یعنی خواہشات اور تمناوں کو ختم کر دیں۔ نروان مسرت کا حصول کی نہیں بلکہ خواہش کے عدم وجود کا نام ہے۔ یہ تھا مذہبی اعتبار سے ایک نقطہ نظر۔ زندگی کے بارے میں اس رویہ کی جھلکیاں اور بھی نظر آتی ہیں ...... فلسفیانہ مکتب فکر میں شوپہناور کا بھی یہی کہنا ہے کہ خواہش لامحدود ہے اور اس کی تکمیل محدود۔ اس کا کہنا ہے کہ ''کسی خواہش کا پورا ہونا ایک بھکاری کو دی جانے والی وہ خیرات ہے جو آج اسے زندہ رکھتی ہے تاکہ کل بھی اس کی مصیبتوں کا سلسلہ جاری رہے۔''

It is like the alms thrown to a begger,
that keeps him alive to day in order
that his misery may be prolonged tomorrow

اس کے نزدیک کسی مقصد کا پورا ہو جانا خود اس مقصد کے لئے مہلک ہے چنانچہ ایک جگہ وہ یوں کہتا ہے۔

'' the better is the enemy of the good '' جب تک خواہش وجود باقی رہے گی انسان رنج والم سے دوچار ہوتا رہے گا۔ غالبؔ نے شاید اسی خیال کی ترجمانی یوں کی تھی

قید حیات و بند غم دونوں اصل میں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

یا ایک اور انداز سے جگر نے بھی کہا تھا۔

مسرت زندگی کا دوسرا نام مسرت کی تمنا مستقل غم

اس نقطہ نظر سے ان ساری باتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ آرزو' تمنا' خواہش نہ صرف ناپسندیدہ بلکہ باعث رنج و آلام ہے۔ اسلئے شر ہے۔ اب دوسرا نقطہ نظر جس کی اقبال نمائندگی کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ خودی کی حیات' آرزو اور مقاصد آفرینی پر موقوف ہے زندگی کی وہ قدریں جن سے عمل بامعنی بنتا ہے محض مجرد خیال یا فریب نہیں بلکہ ان کی روحانی اساس ہے اس نے اعلیٰ نصب العین کے حصول میں خودی کا اظہار آرزو ہی کے ذریعہ ہوتا ہے۔ اقبال کے نزدیک آرزو کی خلش اور

چبھن ہی سے زندگی کا لطف ہے ورنہ اس کے بغیر زندگی بے معنی ہے اس لئے خواہش دکھ کا نام نہیں بلکہ مجروح تیغ آرزو رہنا ہی ہر دکھ کی دوا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ہر بڑی خواہش اعلیٰ نصب العین کے لئے مچلتی ہوگی اور گھٹیا خواہش زندگی کو گھٹیا بنا دے گی۔

اعلیٰ سے اعلیٰ تر' خوب سے خوب تر کی تلاش اور جستجو میں سرگرم سفر رہنا ہی زندگی کی علامت ہے۔ اس لئے غالب بھی دشت امکاں کو تمنا کا ایک قدم قرار دیتے ہیں۔

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب
ہم نے دشت امکاں کو اک نقش پا پایا

یہی وجہ ہے کہ راہ شوق کے مسافر کے لئے راحتِ منزل سے زیادہ نشاطِ رحیل عزیز بن جاتی ہے اسی مسلک کی پیروی میں جگر بھی بے اختیار پکار اٹھتے ہیں۔

جز ذوقِ طلب' شوقِ سفر کچھ اور مجھے منظور نہیں
اے عشق بتا اب کیا ہوگا کہتے ہیں کہ منزل دور نہیں

جدید فلسفہ میں مختلف انواع حیوانی کے ارتقاء کے سلسلے میں کہا جاتا ہے کہ زندگی کے مختلف اعمال یا وظائف' مختلف اعضاء سے عبارت ہیں۔ مثلاً ہم دیکھتے اس لئے ہیں کہ اندھے میکانکی ارتقاء نے ایک منزل پر ہمیں آنکھیں دے دی ہیں۔ ہم چلتے اس لئے ہیں کہ رینگنے کی منزل سے آگے زندگی نے ہمیں پاؤں دے دیئے۔ لیکن اقبال یوں کہتے ہیں کہ جوش حیات' خود اپنا راستہ آپ بناتی ہے، حیات کی ارتقائی تمنائیں خود اپنے اظہار کے سامان تلاش کر لیتی ہیں۔ ذوق جلوہ نے' آنکھ' شوقِ رفتار نے پاؤں اور بلبل کی ذوقِ نوا نے اسے منقار عطا کی ہے۔

اب ہم زندگی کے بارے میں اقبال کے نقطۂ نظر کو بیان کرنا چاہیں تو یوں کہہ سکتے ہیں ''زندگی کی بقاء آرزو پر موقوف ہے کاروان حیات کے لئے مقصد درا کا حکم رکھتا ہے اور بغیر خواہش' آرزو یا تمنا' اعلیٰ نصب العین کے لئے جدوجہد ممکن نہیں۔ گویا زندگی عبارت ہے آرزو سے اور موت آرزو سے محرومی ہے۔

مرگ راساماں ز قطع آرزوست

اقبال کے نزدیک موجودہ دور میں انسانیت کا المیہ یہ ہے کہ وہ اس آرزو سے محروم ہے

جو اسے ہر ٹھوکر پر سنبھلنے کا حوصلہ عطا کرے اور جو اسے موجودہ پستی سے اٹھا کر اعلیٰ منزلوں سے ہمکنار کرے۔ اس لئے وہ سینہ میں مچلتی ہوئی آرزو کے خواہش مند ہیں۔

زندگی در جستجو پوشیدہ است
اصلِ اُو در آرزو پوشیدہ است
ما زتخلیقِ مقاصد زندہ ایم
از شعاعِ آرزو تابندہ ایم

اور کہیں کہیں اقبال کے ہاں یہ لئے اتنی تیز ہو جاتی ہے کہ وہ یہاں تک کہہ اٹھتے ہیں

متاع بے بہا ہے درد و سوز ' آرزمندی
مقام بندگی دے کر نہ لوں شان خداوندی

☆☆☆☆

وقتِ آخر اور تشنگیٔ کار

(آل انڈیا ریڈیو سے ایک نشریہ)

وقت آخر اور تشنگی کار۔ بات بڑی چونکا دینے والی اور ذہن کو جھنجھوڑ دینے والی ہے۔ جب انسان موت کی آہٹ محسوس کرنے لگے اور اس دنیائے عمل سے اس کا رشتہ ٹوٹ جانے والا ہو تو اسے اپنی زندگی میں ادھورے پن کا احساس دامن گیر ہو۔ اُسے اپنے منصوبوں کے نامکمل رہ جانے اور اپنے ارادوں کے ٹوٹ جانے کا خیال ستانے لگے۔ نامرادیوں' محرومیوں کی خلش بے چین کر دے۔ وہ اپنی بے بسی اور کم نصیبی کا شکار ہو جائے۔ اب کیا ہو سکتا ہے؟ اب تو عمل کا دروازہ بند ہونے والا ہے۔ اب نہ تو عمر رفتہ کو آواز دی جا سکتی ہے' نہ وقت کے دھارے کو پلٹایا جا سکتا ہے! وقت آخر تشنگی ادھورے پن کی کیفیات مختلف انسانوں میں جدا ہو سکتی ہیں۔ خلش اور چبھن کی نوعیت الگ الگ ہو سکتی ہے۔

لیکن یہاں ایک سوال ذہن میں آتا ہے۔ کیا تشنگی کار کا احساس اس وقت ہی ہوتا ہے جب موت آدبوچے' یا زندگی کے ہر لمحہ میں یہ احساس ہمارے ساتھ ہے؟ کیا زندگی کے کسی لمحہ میں کوئی انسان یہ کہہ سکتا ہے کہ میں اپنے کام سے مطمئن ہوں۔ میں اپنے ارادوں کی تکمیل میں کامیاب ہوں؟ کیا زندگی کے کسی لمحہ میں آسودگی کا احساس ممکن ہے؟ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر تشنگی کار کے اس احساس کو وقت آخر سے ہی کیوں متعلق کیا جائے؟ ایک یونانی مفکر نے کہا تھا اگر عقل مند انسان کو تھوڑی سی روٹی اور تھوڑا سا پانی میسر آ جائے تو اسے اپنے آپ کو سب بڑے دیوتا جیوپیٹر کے برابر سمجھنا چاہیے لیکن کیا یہ ممکن ہے؟ کیا انسان تھوڑی سی روٹی اور تھوڑے سے پانی پر قناعت کرنے آمادہ ہے؟ انسان کی فطرت کی گہرائیوں میں کبھی ختم نہ ہونے والی آرزوں اور تمناؤں کا ہجوم ہوتا ہے جو ہمیشہ تشنہ ہی رہتی ہیں۔ وہ اسی خیال میں گرفتار رہتا ہے کہ منزل کیلئے دوگام چلوں اور سامنے منزل آ جائے لیکن شاید منزل تک کبھی رسائی نہیں ہوتی۔ جتنا وہ قدم بہ قدم آگے بڑھتا جاتا ہے' منزل دور سے دور ہوتی جاتی ہے۔ غالب نے شاید اسی حقیقت کی جانب یوں اشارہ کیا تھا۔

ہر قدم دوریٔ منزل ہے نمایاں مجھ سے
مری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے

یا

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یا رب ؟
ہم نے دشتِ امکاں کو اک نقش پا' پایا

اب اگر ہم یہ تسلیم کر لیتے ہیں کہ اطمینان یا آسودگی جس کیفیت کا نام ہے اس کا کوئی وقت مقرر نہیں۔ خلش اور چبھن تو ہر لمحہ موجود ہے تو دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا آرزو اور تمنا جو انسان کو ہمیشہ بے چین اور مضطرب رکھتی ہے پسندیدہ ہے ناپسندیدہ؟ زندگی میں خواہشات اور اس کے تسلسل کی کوئی حد نہیں ہے۔

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے

بہت سے ارمان پورے ہو جائیں بھی تو یہ احساس ستائے کہ۔

بہت نکلے مرے ارماں لیکن پھر بھی کم نکلے

تو کیا مسلسل تشنگی کا احساس انسان کا مقدر ہے؟

برنارڈ شاہ نے کہا تھا خواہش کی تکمیل اور عدم تکمیل دونوں المئے ہیں۔ یا' یا سیت پسند فلسفی شوپن ہاور نے بھی کہا تھا کہ خواہش لامحدود ہے اور اسکی تکمیل محدود۔ اور یہ کہ کسی خواہش کا پورا ہونا ایک بھکاری کو دی جانے والی وہ خیرات ہے جو آج اسے زندہ رکھتی ہے تا کہ کل بھی اس کی مصیبتوں کا سلسلہ جاری رہے۔ اس کے برعکس دوسرا نقطہ یہ ہے کہ آرزو ناپسندیدہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ انسان کو خوب سے خوب تر کی تلاش میں مصروف رکھتی ہے۔ اقبال نے کہا تھا۔

دوا ہر دکھ کی ہے مجروحِ تیغ آرزو رہنا

بات بڑھتی جاری ہے جہاں سے شروع ہوئی تھی پھر لوٹ کر وہیں پہنچ گئی ہے آئے اسے مختصر کر دیں ایک طرف یہ خیال ہے کہ زندگی نفس نفس میں تشنگی کی داستاں لے ہوئے ہے یا جگر کے الفاظ میں

مسرت زندگی کا دوسرا نام
مسرت کی تمنا مستقل غم

اور دوسرا نقطہ نظر یہ ہے

نا صبوری ہے زندگی دل کی
آہ ! وہ دل کے ناصبور نہیں

اب کیا ان خیالات میں تطابق اور ہم آہنگی ممکن ہے؟ کیا دونوں کو ایک حقیقت میں سمویا جا سکتا ہے جہاں وقت آخر تشنگی کار کے ساتھ یہ احساس بھی رہے کہ

شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم

اس دوراہے پر آیئے ہم سلامتی کا راستہ تلاش کریں جس پر چل کر انسان اپنی نارسائی کے احساس کے باوجود مطمئن رہے۔ زندگی کی وہ قدریں جن سے عمل بامعنی بنتا ہے، محض مجرد خیال یا فریب نہیں ہے بلکہ ان کی بنیاد روحانی اور اخلاقی ہے۔ اقبال نے اس بات کو یوں پیش کیا ہے۔

متاع بے بہا ہے درد و سوز آرزو مندی
مقامِ بندگی دے کر نہ لوں شانِ خداوندی

یہاں دو باتیں قابل غور ہیں ایک درد و سوزِ آرزو مندی ہے اور دوسرا مقام بندگی ہے اگر عمل کا مقصود بندگی ہو اگر ہر کام کا مقصود ذات واجب اور اس کی رضا ہو تو انسان اپنی محدودیت میں لامحدودیت کی شان محسوس کر سکتا ہے۔ یہاں تشنگی کا احساس باقی نہیں رہتا بلکہ یہی وہ منزل ہوتی ہے جہاں بقول حضرت علیؓ عزائم کی شکست بھی عرفان کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ عبدیت کا احساس اسے ہر آن محرومی کے احساس سے بالاتر کر دیتا ہے بس عمل اور مسلسل عمل اس کا مقصد ہے۔ اگر اس سفر میں دنیائے عمل سے کوچ کا لمحہ آ بھی جائے تو قلب مطمئن رہے۔ وہ لمحہ حزن اور حرماں نصیبی کا نہیں ہے بلکہ شاید اسی کو نفس مطمئنہ کہا گیا ہے۔

☆☆☆☆